شمارہ نمبر4

سہ ماہی

قلم قرطاس

سابق مدیران قلم قرطاس وائس چانسلر جی سی یونیورسٹی فیصل آباد کو گزشتہ شمارہ پیش کرتے ہوئے

قلم قرطاس ادبی مجلس کے تحت صدرِ شعبہ اُردو ڈاکٹر آصف اعوان مہمانانِ اعزاز کو شیلڈز پیش کرتے ہوئے

ڈاکٹر عمران ظفر اور ڈاکٹر نواز کنول کی کتب کی تقریبِ پذیرائی میں مقررین اظہارِ خیال کرتے ہوئے

قلم قرطاس ادبی مجلس کے تحت ڈاکٹر عمران ظفر اور ڈاکٹر نواز کنول کی کتب کی تقریبِ پذیرائی

قلم قرطاس

سہ ماہی | اکتوبر تا دسمبر 2015ء | شمارہ 4

قلم قرطاس ادبی مجلس
شعبہ اُردو جی سی یونی ورسٹی فیصل آباد

مجلس مشاورت

قیمت: 70 روپے

پتہ برائے خط کتابت

ڈاکٹر طارق ہاشمی
0345-9384252

عثمان حفیظ تبسم
0303-6399392

قلم قرطاس ادبی مجلس
شعبہ اُردو جی سی یونی ورسٹی فیصل آباد

حسنِ ترتیب

اداریہ		۵
نعت	ساجد رضا	۷
مضامین		
اُردو میں تدوین متن کی روایت	خرم یاسین	۸
منزلِ اقبال	ناصر علی وارثی	۱۶
اُردو غزل ایک جائزہ	محمد بلال	۲۲
اُردو نظم کا ارتقاء	زینب زاہد	۲۷
نفاذِ اُردو عصری ضرورت	حافظ عامر شہزاد	۳۲
اُردو ادب کا درخشندہ ستارہ (شبلی نعمانی)	خورشید راضیہ	۳۵
افسانے		
عشق زور آور	عثمان حفیظ تبسم	۴۰
اُستاد صاحب	محمد مزمل صدیقی	۴۶
بھوک	دانش حسین	۵۴
ادھورا خواب	الوینا حیدر	۵۸
حادثہ	حافظ حیات	۶۲

انشائیہ

پلنگ پر چیتا	ڈاکٹر سعید احمد	۶۵

تبصرہ

مٹی کا قرض	مدیحہ سعید	۷۳

غزلیات

لبِ خموش مرا، بات سے زیادہ ہے	ڈاکٹر طارق ہاشمی	۷۶
خوابوں سے بھرے رستے	ڈاکٹر اصغر علی بلوچ	۷۷
آنکھوں نے تیری یاد کی برکھا سنبھال کر	ماجد مشتاق رائے	۷۸
کیوے زلزلے ہیبت ڈھاتے ہیں۔۔۔	سجیل قلزم	۷۹
کسی تنکے کا سہارا نہیں ملنے والا	اعجاز احمد	۸۰

اہم نوٹ

۱۔ اشاعت کی غرض سے آنے والی نگارشات کے انتخاب کا دارومدار سرپرست قلم قرطاس کی منظوری پر ہوگا۔

۲۔ نگارشات گروہی تعصب سے پاک ہونی چاہئیں۔

۳۔ نگارشات کے متن سے مجلس ادارت قلم قرطاس کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

اداریہ

صد شکر کہ قیامِ پاکستان کے ۷۰ سال بعد آخر کار عدالتِ عظمیٰ نے اُردو زبان کو بطور دفتری و سرکاری زبان رائج کرنے کا تاریخی فیصلہ صادر فرمایا۔ یہ فیصلہ اُردو زبان کی محبت سے سرشار ایڈووکیٹ کوکب اقبال دائر کردہ درخواست پر کیا گیا۔ برطانوی نوآبادیاتی حکمرانوں نے ہندوستان پر غلبہ پایا۔ تو اس خطہ کے باسیوں کو باور کروایا کہ برصغیر کی مقامی زبانیں مملکت کے نظم و نسق کو چلانے کی متحمل نہیں۔ لہٰذا ہندوستان کی مقامی زبانوں کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے انگریزی زبان کو مسلط کر دیا گیا۔ یوں برصغیر کی عوام چاہتے نہ چاہتے ہوئے بھی انگریزی زبان کو پڑھنے اور سیکھنے پر مجبور ہو گئی، مگر قیامِ پاکستان کے بعد اُردو زبان کی اہمیت کو انتہائی شدت سے محسوس کرتے ہوئے ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو قائداعظم نے قوم کے نام اپنے تاریخی پیغام میں واشگاف الفاظ میں فرمایا ''میں آپ کو واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اُردو ہو گی اور صرف اُردو اور اُردو کے سوا کوئی زبان نہیں ہو گی۔ انتہائی افسوس کہ پاکستان کے پہلے آئین سے رائج الوقت آئین میں اُردو کو اس کا اصل مقام دلانے کے لیے سنجیدہ کوشش نہیں ہوئی۔ ۱۹۵۶ء کے آئین میں اُردو کے برابر بنگالی زبان کو قومی زبان کا درجہ دے کر بانی پاکستان کے فرمان کی واضح نفی کر دی گئی۔ ۱۹۷۳ء کے آئین میں اُردو کو قومی زبان کی حیثیت تو مل گئی مگر سرکاری و دفتری طور پر رائج کرنے کے لیے ۱۵ سال کا ایک طویل عرصہ مقرر کر دیا گیا لیکن اس طویل عرصہ کے گزرنے کے بعد بھی حکومتی اداروں کی طرف سے کوئی پیش رفت نہ ہوئی۔ اس صورتِ حال میں عدالتِ عظمیٰ نے اپنے آئینی اختیارات بروئے کار لاتے ہوئے تاریخی فیصلہ صادر فرما کر کج فہم انتظامیہ پر واضح کر دیا کہ ہٹ دھرمی اور اُن کی نااہلیوں کی وجہ سے اُردو کی حیثیت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔ منصف اعلیٰ

عزت مآب جواد ایس خواجہ نے اُردو زبان کے حق میں فیصلہ صادر کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ منصف اعلیٰ کا حلف بھی اُردو زبان میں اٹھا کر اردو کے وقار اور اہمیت کو چار چاند لگا دیے۔ ایڈووکیٹ کوکب اقبال اور منصف اعلیٰ جواد ایس خواجہ کی اُردو زبان سے والہانہ محبت دیکھتے ہوئے مجھے اُردو کے معروف شاعر اختر شیرانی یاد آ رہے ہیں جنہوں نے اُردو زبان کے حوالے سے الفاظ کے موتی پروتے ہوئے لکھا ہے:

اُردو کی گود میں ہم پل کر بڑے ہوئے
سو جان سے پیاری ہم کو اُردو زبان ہماری
مٹ جائیں گے مگر مٹنے نہ دیں گے اس کو
ہے جان و دل سے پیاری ہم کو اُردو زبان ہماری

اس تاریخی فیصلے کے بعد میں پُر امید ہوں کہ ایک لمبی جدوجہد کے بعد آخر کار اُردو زبان کو اس کا اصل مقام مل پائے گا۔ میں اُردو زبان کے فروغ کے لیے کوشاں ہر فرد کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔

مدیرِ اعلیٰ
عثمان حفیظ تبسم

ساجد رضا

نعت شریف

ہادیٔ دو جہاں سلام سلام
اِک نظر ہو یہاں سلام سلام

آپ کے دم سے رونقیں ساری
مرکزِ لامکاں! سلام سلام

ظلمتوں کے سحاب چھٹنے لگے
رہبرِ کارواں ، سلام سلام

آپ کا نقشِ پا چھوا جس نے
ہو گیا جاوداں سلام سلام

آپ کی رحمتوں نے بخشی جِلا
آپ ہیں مہرباں سلام سلام

آپ خیرالبشر ہیں ، چارہ گر
آپ کا آستاں سلام سلام

سبز گنبد نظر میں ہو ساجدؔ
نور کا ہو سماں سلام سلام

خرم یاسین

اُردو میں تدوین متن کی روایت

تدوینِ متن ایک ترکیب ہے جو اضافت کے ذریعے تدوین اور متن کو جوڑے ہوئے ہے۔لفظ تدوین،عربی زبان کا لفظ ہے جو کہ ہیئت میں مونث ہے اور ایک فن کی حیثیت رکھتا ہے جب کہ اس کا معنی تالیف کرنا،جمع کرنا یا مرتب کرنا ہے۔ (۱)

جبکہ لغات کشوری میں تدوین کے معنی ''جمع کرنا اور تالیف کرنا'' کے ہیں۔ (۲)

اضافت کے بعد اگلے سہہ حرفی لفظ متن کے معنی کتاب کی اصل عبارت، کتاب، کپڑے یا سڑک کے بیچ کا حصہ، درمیان، وسط، درمیانی اور پشت کے ہیں۔ (۳)

متن انگریزی لفظ Text کا ہم معنی ہے جو کہ عبارت یا عکس، نقشِ عبارت کے زمرے میں آتا ہے۔ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اسٹنڈرڈ اردو ڈکشنری کے صفحہ نمبر ۱۲۰۸ سے اس کی تعریف یوں نقل کی ہے:

> ''مصنف کے اصل الفاظ، کتاب کی اصل عبارت (شرح وغیرہ سے قطع نظر کر کے)، کتاب الٰہی انجیل (وقرآن) وغیرہ کی آیت یا آیات جو کسی وعظ یا مقالے کے موضوع یا سند کے طور پر استعمال کی جائیں۔متن کتاب کا مضمون (حواشی وغیرہ سے قطع نظر کر کے)۔جلی خط، نصاب کی کتاب، درسی کتاب۔'' (۴)

پروفیسر ایس ایم کاترے نے متن کی تعریف اپنی کتاب Indian Textual Criticim Introduction to میں صفحہ نمبر ۲۷ پر اس طرح سے کی ہے:

> "By a text we understad a document written in a language known more or less to the inquirer and assumed to have a meaning which has been or can be ascertained. Sinca a text implies a written document, the knowledge of writing has to be

presumed the basis of our study.

تدوین درحقیقت کیا ہے؟ اس حوالے سے پروفیسر خالق داد ملک اپنی کتاب ''تحقیق وتدوین کا طریقہ'' میں اس طرح سے رقمطراز ہیں:

''اردو زبان میں تدوین عربی میں تحقیق اور انگریزی میں ایڈیٹنگ(Editing) ایک جدید اصطلاح ہے جس سے مراد مخطوطہ (قلمی کتاب) کو ایسی شکل میں متعارف کروانا ہے جیسے کہ اس کے مؤلف نے اسے اپنے ہاتھ سے تحریر کیا تھا۔ وہ قابل مطالعہ وقابل فہم ہو جائے اور مقرری معیارات کے مطابق اسے مدون شکل میں پیش کیا جائے۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی مخطوطہ کی تدوین کا عمل اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ مخطوطہ کا عنوان، اس کے مولف کا نام، مخطوطہ کی مولف کی طرف نسبت، مخطوطے کی عبارت اور اس میں آنے والے تمام مواد کو اول لفظ سے آخری لفظ تک پوری تحقیق، تصدیق اور ضبط کے ساتھ مرتب و مدون کیا جائے اور اسے ایسی صورت میں منصۂ شہود پر لایا جائے جو اس کے مولف کی وضع کردہ صورت کے بالکل مطابق ہو۔''(۵)

مخطوطہ کی بحث میں اس سے مراد ایسی ہر قلمی کتاب ہے جو مولف نے خود اپنے ہاتھ سے لکھی ہو یا اس کے شاگردوں میں سے کسی نے اسے اپنے ہاتھ سے لکھا ہو یا ان کے بعد آنے والے کاتبوں نے اسے ہاتھ سے تحریر کیا ہو۔ تدوین کے حوالے سے مخطوطہ سب سے اہم مقام رکھتا ہے۔ اس کی بہت سی اقسام ہیں جن میں سے پہلی اور سب سے زیادہ اہم اصل نسخہ ہے جسے خود مصنف نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہو۔ یہ نسخہ اصلیہ یا نسخۃ الام بھی کہلاتا ہے جس کو انگریزی میں Orignal Copy کہا جاتا ہے جبکہ اس کے بعد جو نسخہ اصل نسخے سے کاپی کیا گیا ہو وہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے بعد فرعی نسخے جنھیں اصل یا ثانوی نسخوں سے نقل کر کے تیار کیا گیا ہو۔ کوئی نسخہ جو اصل نسخے سے جتنا قریب العہد ہوگا اتنا ہی اہم ہوگا۔ اگر دنیا بھر میں مخطوطات کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو یہ اندازہ لگانا ہرگز مشکل نہیں ہوگا کہ یہ کام اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ فنِ کتابت۔ انسان نے جب سے لکھنا پڑھنا سیکھا تبھی سے مخطوطات کا آغاز ہو گیا تھا لیکن یہ مخطوطات کاغذ پر نہیں لکھے گئے تھے۔ انسان نے اول اول تو اپنے خیالات کے اظہار وابلاغ کے لیے پتھروں پر ان کی ترجمانی لکھنے کی صورت کی جس کا پہلا روپ عجیب وغریب اشکال کی صورت میں تھا۔ بعد میں

یہی اشکال علامات اور پھر الفاظ کی صورت میں ڈھلنے لگیں۔ پھر یہ فن مذہبی عبارات و آیات کو دیواروں پر کندہ کاری کرنے کی طرف مائل ہوا۔ وہاں سے مخطوطات کی حفاظت کے لیے چمڑے اور پتوں کا استعمال کیا جانے لگا جنھیں انسان نے لکھنے کے لیے استعمال کیا۔ بہت ساری جگہوں پر کپڑا بھی اس مقصد کے لیے استعمال ہوا۔ اس کے بعد چین کے ایک موجد تسائی لون نے کاغذ کی ایجاد کے ساتھ ہی یہ سہرا اپنے سر باندھ لیا اور دنیا بھر میں فنِ کتابت تیزی سے پروان چڑھنے لگا۔ اس طرح دنیا بھر میں مخطوطات کی تاریخ میں سب سے پہلے مخطوطات کی اقسام پتھروں کی تھی، دوسری چمڑے، پتے، کپڑے اور تیسری کاغذ کی۔

جب ان مخطوطات کی جانچ پرکھ کا کام شروع ہوا اور انھیں سمجھنے اور جدید عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کا کام شروع ہوا تو تدوینِ متن کا آغاز ہوگیا۔ یوں عرفِ عام میں کہا جاسکتا ہے کہ تدوینِ متن کی اصطلاح سے مراد ہے کہ مصنف کی اصل عبارت کو احسن انداز میں جمع کرنا اور ترتیب دینا۔ یہ ترتیب اس طرح کی ہو کہ اصل اور نقل عبارت میں فرق واضح کر سکے اور یہ بیان کر سکے کہ اصل عبارت میں کہاں کہاں اور کیا کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں ہیں۔ اس حوالے سے پروفیسر S.M کاترے نے متنی تنقید کی بھی وضاحت کی ہے جو کہ تدوینِ متن سے جُڑی ہوئی ہے۔

> ''متنی تنقید کا کام مخطوطات کی داخلی کیفیات کی شہادت پر مصنف کے متن تک پہنچنے کی کوشش ہے۔''(۶)

گو کہ اردو میں مخطوطات کی تاریخ بہت زیادہ پرانی نہیں ہے بلکہ یہ مورخین کے مطابق اردو کے جنم لینے کے بعد آغاز پذیر ہوئی اور اسی لحاظ سے مخطوطات کی تدوین بھی بہت زیادہ پرانا کام نہیں لیکن اگر دنیا بھر کی زبانوں میں موجود مخطوطات کی تدوین کے حوالے سے دیکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف اردو میں اس سے قدرے بے اعتنائی برتی گئی بلکہ اعلیٰ درجے کے مدونین کی تعداد بھی محدود رہی ہے۔ مخطوطات کی کم یابی کی ایک وجہ لائبریریوں میں اور ذاتی ذخیروں میں موجود مخطوطات کی جانب عدم توجہی بھی ہے۔ ڈاکٹر عطا الرحمٰن میو اُردو میں تدوینِ متن کی روایت کے حوالے سے اس طرح رقمطراز ہیں:

> ''اُردو ادب میں کتابوں کی تصنیف و تالیف کا باقاعدہ باضابطہ ادارہ ایشیاٹک سوسائٹی (بنگال) کے نام سے 15 جنوری 1784 سے وارن ہینگز (Warren Hastings) کی

سرپرستی میں قائم ہوا۔ اس کے پہلے بانی صدر سر ولیم جونز کے بیان کے مطابق اس ادارے کا دائرہ کار ایشیا کے علمی، تمدنی اور تاریخی کارناموں کی تحقیق مغرب کے جدید اصولوں کے مطابق کرنا تھی۔ اس کے بعد 1800ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں قائم ہوا جس کا مقصد انگریز افسروں کے واسطے، جو تازہ وارد ہوئے تھے، ایسی کتابیں تیار کی جائیں جن سے انتظام ملکی اور ہندوستانیوں کے ساتھ میل جول اور ربط وضبط بڑھانے میں آسانی ہو۔"(۷)

اردو میں تدوین کے ابتدائی دور میں اس کی صورت کیسی تھی اس حوالے سے رام بابو سکسینہ، تاریخِ ادب اردو میں اپنی تحقیق ان الفاظ میں سمیٹتے نظر آتے ہیں:

"ان اداروں میں جو کتب تحریر ہوئیں، ان کا تدوینی معیار بہت حد تک ابتدائی شکل میں تھا لہٰذا ناقص تھا۔ آج امتدادِ زمانہ سے متعدد پہلوؤں سے مخطوطات اور مسودات کی ترتیب وتدوین میں جدید اصولوں کے مطابق اضافہ ہوتا ہے، ترمیم وتنسیخ ہوتی ہے۔ اضافہ یا ترمیم وتنسیخ ان معنوں میں نہیں کہ تحریف کی جائے بلکہ ان معنوں میں کہ وقت کے ساتھ ساتھ الفاظ کا املا اور جملے میں الفاظ کی تقدیم وتاخیر میں جو تغیر آتا ہے جب یہ مسودہ تدوین کی سان پر چڑھتا ہے تو اسے مدون اپنے دور کے اصولوں کے مطابق تیار کرتا ہے۔ اس کی بہترین مثال باغ وبہار کا وہ نسخہ ہے جسے رشید حسن خاں نے مرتب کیا ہے۔ باغ وبہار، میر امن نے فورٹ ولیم کالج میں ملازمت کے دوران تحریر کی۔ میر امن کے دور میں الفاظ کا جو املا رائج تھا جو بعض محاورات والفاظ رائج تھے، امتدادِ زمانہ سے وہ متروک ہوگئے۔ بعد میں ان کا املا بدل گیا۔ رشید حسن خاں نے جب اسے مدون کیا تو الفاظ کا وہ املا اختیار کیا جو آج رائج ہے۔"(۸)

ایک اور جگہ پر ڈاکٹر عطا الرحمٰن رائے دیتے ہیں کہ اردو ادب میں تصنیف وتالیف کا کام اسی دور میں شروع ہوا جب تدوینِ متن کی پاس داری کا اہتمام نہیں کیا جاتا تھا۔ چھاپہ خانے کے رواج سے پہلے قلمی نسخوں کی نقول تمام تر کاتبوں اور خطاطوں کی مرہونِ منت تھیں۔ وہ نقلِ متن کو مروجہ اسلوب کے مطابق اور کچھ اپنی افتادِ طبع کے مطابق نقل کر دیتے تھے۔ اس میں بہت سی لغزشیں بھی ہو جاتی تھیں اور تحریف والتباس کا دروازہ بھی کھل جاتا تھا۔

درجہ بالا بحث کے باوجود اردو میں متنی تنقید بالکل نئی نہیں ہے۔اس کا سرا اردو کے اس پہلے دور سے جڑا ہوا ہے جب بارھویں صدی عیسوی کے شاعر امیر خسرو نے اردو شاعری کی جو داغ بیل ڈالی اس کلام کو اکٹھا کرنے اور ان کا ذکر اردو کے اولین شعرا کا تذکرہ کرنے کی بابت بات ہوئی ،تب سے ہی تدوینِ متن کا بے قاعدہ آغاز ہوا۔لیکن یہ تدوین تذکروں میں اردو و فارسی شعرا ء کے تذکروں اور ان کے نمونہ کلام سے آگے کچھ اور نہیں تھی۔تذکروں سے چلنے والا سلسلہ بہت آہستگی سے تدوین کے مراحل میں داخل ہوا۔ بہر حال ابھی تک پاک و ہند کی تاریخِ ادب میں تحقیق کی دو صورتیں دستیاب ہیں اول کا تعلق متون کی تدوین سے ہے جبکہ دوئم حقائق کی بازیافت اور ان کی تفہیم و تحلیل سے تعلق رکھتی ہے۔تحقیق کی پہلی قسم میں کلاسیکی ادب کا حصہ زیادہ رہا ہے اور اس میں چوں کہ کلام (نظم اور نثر) دونوں ہی مخطوطات کی صورت میں دست یاب ہیں اس لئے ان کی تدوین ایک مشکل مرحلہ بھی ٹھہرا اس سلسلے میں ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش اپنی کتاب ''اردو میں اصولِ تحقیق'' کے مقدمہ میں اس طرح سے رقمطراز ہیں:

''(چوں کہ) قدیم مشرقی زبانوں کا کلاسیکی ادب زیادہ تر مخطوطات کی شکل میں ملتا ہے اور انھی قلمی نسخوں کی مدد سے ان کی ہیئت اور حدود تک رسائی ممکن ہے اس لیے کہ ہر متن ایک مستقل وجود ہے اور اپنی مختلف روایتوں کی شکل میں اپنے میں ایک سے زیادہ ذیلی وجود رکھتا ہے۔ایسی صورت میں متون کی صحیح ہیئت اور حدود روایت کا تعین ایک نہایت اہم ،مشکل مگر نتیجہ خیز کام ہے،جس کیلیئے غیر معمولی سطح پر ذہنی کاوش اور اہتمام تلاش جزئیات ضروری ہوتا ہے، اس کے بغیر حقیقت تک رسائی ممکن نہیں۔اس میں بہت سوجھ بوجھ سے کام لینے کی ضرورت ہے اور روایتہً اور درایتہً صحیح اخذ کرتا ہے۔ترتیب متن کا کام سائنسی نہ ہوتے ہوئے بھی ایک سائنسی طریقہء کار کا تقاضا کرتا ہے جس سے مآخذ کی جستجو اور معیار بندی ہو سکے۔''(۹)

اردو کو بطورِ زبان شروع ہوئے کم و بیش چھ سو سال ہو چکے ہیں مگر تدوین کا کام ابھی تک نامکمل ہے۔جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ اردو میں تدوین کے ذرائع مخطوطات اور تذکرے ہی تھے جن سے کسی بھی شاعر یا ادیب کا کلام تدوین کیا جا سکتا تھا اس لئے اردو میں تدوینِ متن کا ذکر ان تذکروں کے بغیر ادھورا ہے جنھوں نے اردو میں تدوین کو بنیادی صورت عطا کی۔ یہاں یہ واضح

کرنا بھی ضروری ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد اس نظریے کے قائل ہیں کہ اردو میں پہلے نظم اور اس کے بعد نثر کی ایجاد ہوئی۔ اس لیے اردو میں تدوین کے حوالے سے شعراء کرام کے کلام کا ہی زیادہ حصہ ملتا ہے۔ اس زبان میں جو تذکرے لکھے گئے ہیں وہ اردو تحقیق کے ابتدائی نقوش ہیں۔ تذکروں کے بعد محمد حسین آزاد کی ''آب حیات'' سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ آب حیات تذکرہ نویسی اور با قاعدہ تاریخ نویسی کے درمیان مضبوط کڑی ہے۔ اگرچہ اس پر بہت اعتراض کیے گئے اور اس کے بعض معلومات کو غیر مستند قرار دیا گیا تاہم آبِ حیات کی بنیادی حیثیت کے بارے میں کلام نہیں۔

اردو میں تحقیق و تدوین کے حوالے سے سرسید احمد خان کی علم دوست تحریک کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس کی وجہ سے جو نیا علمی اور سائنسی رُجحان پیدا ہوا، اس سے تحقیق کو بھی تقویت پہنچی۔ بیسویں صدی میں اس روایت کی مزید توسیع محمود شیرانی، ڈاکٹر عبدالحق، مولوی محمد شفیع، قاضی عبدالودود مسعود حسن رضوی اور امتیاز علی عرشی جیسے بلند پایا محققین ادب کے ہاتھوں ہوئی۔ آزادی سے پہلے ہی ہندو پاک میں نئی آگاہی کے احساس کے ساتھ ساتھ تحقیقی ضرورت کا احساس بھی روز بروز بڑھنے لگا اور تحقیق کی مضبوط اور مسلسل روایت اُسی وقت قائم ہوئی جب تعلیم کی اعلیٰ جماعتوں میں اردو کو فروغ دیا گیا۔ جامعات میں نہ صرف اردو بلکہ دوسری زبانوں اور دوسرے مضامین میں بھی تحقیق پر زور دیا گیا۔ ان مضامین میں تحقیق کے اصول مغرب سے لیے گئے۔ ان کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کی تحقیق میں بھی مغربی طریقہ کار سے استفادہ کیا گیا۔ بقول سلطانہ بخش برصغیر پاک و ہند میں اردو کے مختلف شعبوں میں ہر سطح پر بکثرت تحقیقی کام ہوا ہے، جن میں لسانیاتی تحقیق قدیم متون کی دریافت، متون کی تصحیح و ترتیب، اصناف، عہد اور مشاہیر ادب پر تحقیق، حوالے کی کتابوں کی فہارس، نادر مخطوطات کی فہارس، ادبی تاریخیں اور تبصرے تصنیف ہوئے۔ اس عرصے میں تحقیق کا اتنا زیادہ کام ہوا ہے کہ ان کا اجمالی جائزہ لینا بھی مشکل ہے۔

متون کو صحت کے ساتھ پیش کرنا تحقیق و تدوین میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں پاک و ہند دونوں جانب کے محققین نے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ پاکستان میں اس حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے فخر الدین نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، دیوان حسن شوقی اور دیوان نصرتی اردو ادب کے حوالے سے اہم کام کیا جبکہ دکنی ادب کی دریافت کے سلسلے میں مولوی عبدالحق کی مرتبہ نصرتی کی مثنوی ''من لگن''، رستمی بیجاپوری کی مثنوی ''خاور نامہ'' مرتبہ

چاند حسین شیخ، شاہ تراب بیجاپوری کا ''دیوان تراب'' مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش اور شاہ قاسم اورنگ آبادی کا ''دیوان'' مرتبہ سخاوت مرزا پہلی بار ترتیب وطباعت سے مزین ہوئے۔ ان کے علاوہ ایک نایاب بیاض، دکنی شعرا کے چند نایاب مرثیے، مثنوی ''برہ بھبھوکا'' مثنوی ''مثل خالق باری'' اور ''ارشاد نامہ'' دیوان ولی کا غیر مطبوعہ کلام اور مثنوی ''معنوی'' پاکستان کے مختلف علمی اور ادبی رسالوں میں شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر خلیق انجم نے خواجہ بندہ نواز کی معراج العاشقین، جاوید وشسٹ نے سب رس کے حوالے سے قصہ حسن و دل، ڈاکٹر غلام عرفان نے غواصی کی مثنوی مینا ستونتی، ڈاکٹر مسعود حسین خان نے بیدری ''پرت نامہ'' مبارز الدین رفعت اور زینت ساجدہ نے ''کلیاتِ شاہی'' کو مرتب کیا۔ دیوان ہاشمی ''کلمتہ الحق'' مثنوی چندر بدن ومہیار، قصہ رضوان شاہ وروح افزا، مثنوی طالب وموہنی، علی نامہ، گلشنِ عشق، مثنوی تصویرِ جاناں، پنچھی راچھا، کلیات غواصی اور من سمجھاون بھی بڑے سلیقے سے مرتب کر کے شائع کیے گئے۔ پاکستان میں شمالی ہند کی منظومات کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں فگار دہلوی کا کلام، اسمٰعیل امروہوی کی دو مثنویاں ''وفات نامہ بی بی فاطمہ اور معجزہ انار'' مسدس رنگین، شاہ حاتم کا ''دیوان زادہ'' مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، عالم شاہ ثانی کے فرزند جہاں وارشاہ کا ''دیوان'' مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی (ضمیموں کا اضافہ ڈاکٹر صاحب کے تحقیقی مزاج کا آئینہ دار ہے)۔ خلیفہ معظم کی مثنوی جنگ نامہ آصف الدولہ ونواب رام پور، دیوان حیدری، شکوہ فرنگ اہم کام رہے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے منثور اور منظوم کلام کی ترتیب وتدوین کی جا چکی ہے۔

اردو میں تذکروں سے شروع ہونے والی تدوین کا کام اس وقت روز افزوں ہو چکا ہے۔ اب اسے سائنسی بنیادوں پر بھی استوار کیا جا رہا ہے اور ایسے سائنسی آلات موجود ہیں جن سے کسی بھی تحریر کا اس کے کاغذ اور روشنائی کی تاریخ کا پتہ چلانا ہرگز مشکل نہیں رہا۔ اگر تعداد کے حوالے سے تدوین کا کام دیکھا جائے تو اس وقت تحقیق وترتیبِ متن پر لکھی جانے والی کتب کی تعداد ۳۰ سے زائد ہے جبکہ مخطوطات ومطبوعات کی فہرستوں کی بات کریں تو یہ ۲۰ سے زائد موجود ہیں۔ وہ تذکرے جو ابھی تک دریافت ہو سکے ان کی تعداد ڈاکٹر سلطانہ بخش نے ۶۵ بتائی تھی لیکن اب ان کی تعداد ۷۰ سے تجاوز کر چکی ہے جبکہ مرتب کردہ متون کا ذکر کریں تو ان کی تعداد ۷۰ کے قریب ہے۔

حوالہ جات

۱۔ فیروز اللغات صفحہ نمبر ۳۱۶، طبع اول، فیروز سنز، لاہور ۱۹۶۸ء
۲۔ لغات کشوری، صفحہ نمبر ۹۶، دارالاشاعت، کراچی
۳۔ فیروز اللغات صفحہ نمبر ۱۰۴۷، طبع اول، فیروز سنز، لاہور ۱۹۶۸ء
۴۔ تنویر احمد علوی، ڈاکٹر، اصول تحقیق و ترتیب متن صفحہ نمبر ۲۳، سنگت پبلشرز، لاہور ۲۰۱۳ء
۵۔ خالق داد ملک، پروفیسر، تحقیق و تدوین کا طریقہ، صفحہ نمبر ۱۱۲، اورینٹل بکس لاہور، ۲۰۱۲ء

6. Prof.S.M Katre,Introductioin to Indian Textual Criticim. P.30

۷۔ عطاالرحمٰن میو، ڈاکٹر، تحقیقی مجلّہ الماس، صفحہ نمبر ۱۶۸، شعبہ اردو، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی خیر پور، سندھ ۲۰۱۳۔۲۰۱۲ء
۸۔ رام بابو سکسینہ، تاریخِ ادب اردو (ترجمہ مرزا محمد عسکری) صفحہ نمبر ۳۱
۹۔ ایم سلطانہ بخش، ڈاکٹر، اردو میں اصولِ تحقیق، صفحہ نمبر ۱۱، انتخاب مقالات، مقتدرہ قومی زبان طبع اول جون ۱۹۸۸ء

ناصر علی وارثی

منزلِ اقبال

کائنات کی ہر چیز اپنے مدار کی طرف سفر کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ہر شے کی کوئی نہ کوئی منزل ہے۔ جس کا تعین قدرتی ،فطرتی یا جبلی طور پر کیا ہوا ہمیں نظر آتا ہے۔ قدرت نے ہر کسی کے لیے ایک منزل کا تعین کیا ہے۔ مگر اس سے ذرا آگے نکل کر دیکھیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ہر شہ اپنے ہاتھ میں نہیں رکھی بلکہ خود انسان اور دوسری مخلوقات کو بھی کچھ اختیارات دیے ہیں۔ جن کی بدولت وہ زندگی گزارتے اور اپنی منزل کا تعین کرتے ہیں۔ اب بحث یہ پیدا ہوتی ہے کہ تقدیر جو لوح وقلم پر لکھی جا چکی ہے اور دُعا جو تقدیر کے بدلنے کا بھی اثر رکھتی ہے۔ دونوں آپس میں متضاد نظر آتے ہیں۔ اور پھر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ تقدیر ہی سب کچھ ہے یا دعا بھی کچھ اثر رکھتی ہے۔ اسی طرح دعا پر ہی ہر چیز کا دارومدار ہے یا تقدیر ہی اصل رہنما ہے؟ انسان سست، جاہل اور کاہل ہونے کے ناطے ان دونوں میں سے کس پر بھروسہ کرے؟ بہر حال یہ ایک سوال ہمارے ہاں موجود ہے۔ جس کا جواب ملنا باقی ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں اقبال سے اس کا جواب لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

کائنات میں موجود دو طرح کے نظریات ملتے ہیں۔ ایک یہ کہ تقدیر ہی سب کچھ ہے۔ تقدیر کے آگے کوئی شے اپنے پَر نہیں مار سکتی۔ جبکہ دوسرا نظریہ ہمیں دعا کے بارے میں ملتا ہے۔ جس میں یہ سوچ نظر آتی ہے کہ دعا تقدیر کو بدلنے کی طاقت رکھتی ہے۔ کائنات میں اس سوچ کے حامل دو طرح کے لوگ ملتے ہیں۔ جو بحث مباحثہ کے بعد بھی تقدیر اور دعا پر اپنا یقین پختہ کیے ہوئے ہیں۔

حضرتِ انسان نے جب تھوڑی جدت اختیار کی اور علم و ادب میں کچھ شعور حاصل کیا تو تیسرا نظریہ یوں گویا ہوا کہ تقدیر اور دعا تو بہر حال اپنی جگہ ہیں مگر ان سے آگے انسانی محنتِ شاقہ

بلند مقام رکھے ہوئے ہے۔ وہ ان دونوں سے ہی آگے ہے۔ گویا کہ انسان نے یہ نظریہ دے کر اپنی سستی، کاہلی اور جاہلیت کو ختم کرنے کا عندیہ دیا۔ ساتھ یہ بھی بتایا کہ انسان اپنی طاقت سے قدرت، فطرت اور جبلت کو بدلنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ انسانی طاقت تیسرے نظریہ کے مطابق پہلے سے ہی خُدا تعالیٰ کی طرف سے انسان کے اندر ودیعت کی گئی ہے۔ اب انسان کی بصیرت اس جہاں گیر ہمت کو تلاش کرنے میں کہاں تک کامیاب ہو سکتی ہے اس کا جواب ہمیں اقبال کے ہاں بھر پور نظر آتا ہے۔ اور اِدھر سے ہی ہمیں اقبال کی منزل کا پتہ ملتا ہے کہ وہ کس منزل کے راہی تھے اور منزل کے بارے وہ اپنے کیا خیالات و نظریات رکھتے تھے۔

حضرتِ اقبال تقدیر اور دعا سے ہوتے ہوئے تیسرے نظریے یعنی انسانی محنت، آگے بڑھنے اور نئے راستے تلاش کرنے پر زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک قدرت نے انسان کو ہر طرح کے کمالات سے نواز رکھا ہے۔ ان کمالات کو تلاش کرنا اور پھر استعمال میں لانا خود انسان کی مرضی میں شامل ہے۔ علامہ کہتے ہیں کہ اب انسان ان کمالات کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی دنیا آپ پیدا کرے۔ جس کے لیے سخت سے سخت محنت ضروری ہے اور اس محنت میں منزل کا کوئی تعین نہیں ہے۔ بس دن رات آگے بڑھنا ہے اور آگے بڑھتے چلے جانا ہے۔ جو انسان منزل پر یقین رکھتا ہے وہ بہت جلد ایک مقام کو منزل سمجھ کر رُک جاتا ہے مگر اقبال یہ درس دیتے ہیں کہ منزل آگے بڑھنے اور محنت کرنے کا نام ہے۔ جب اقبال سے پوچھا کہ کتنا آگے بڑھنا ہے تو علامہ نے یوں فرمایا کہ:

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

مزید یوں بھی فرمایا کہ:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

گویا کہ انسانی محنت اور اس کی خودی تقدیر سے پہلے ہے۔ وہ خدا تعالیٰ سے اپنی تقدیر خود لکھوا سکتا ہے۔ لیکن ہم جس کو منزل سمجھ کر اور خودی کو بلند کر کے اپنی تقدیر لکھنے بیٹھ جاتے ہیں یا پھر منزل سمجھ لیتے ہیں دراصل اقبال کی یہاں سے ابتدا ہوتی ہے۔ وہ اس کو منزل نہیں گردانتے بلکہ

وہ تو اس سے آگے اصل سفر سمجھتے ہیں۔ جب خودی کو محنتِ شاقہ سے اتنا بلند کر لیا کہ اب تقدیر کے لکھنے کا وقت آیا پھر ہی تو اس کا سفر شروع ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی پوری شاعری میں ہمیں ایک جگہ بھی منزل کا تصور نظر نہیں آتا۔ وہ تھکنے اور رکنے اور پھر کسی مقام پر پہنچنے کے بعد اُسی کو منزل سمجھ لینے کا پیغام نہیں دیتے۔ اقبال فرماتے ہیں:

تو ہما کا ہے شکاری، ابھی ابتدا ہے تیری
نہیں مصلحت سے خالی یہ جہانِ مرغ و ماہی
نہ دیا نشانِ منزل مجھے اے حکیم تو نے
مجھے کیا گلہ ہو تجھ سے تو نہ رہ نشیں نہ راہی

علامہ تو شکوہ کے انداز میں بھی یہی کہتے ہیں کہ میں کسی کو منزل کی خبر کیا دیتا مجھے تو خود منزل کا پتہ نہیں مگر علامہ اس میں بھی مصلحت سے ہی چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ منزل کے پجاری بھی نہیں بنتے اور انسان کو اس کی منزل سے بھی آگاہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ لندن میں قیام کے دوران لکھے گئے اپنے چند اشعار میں یوں کہتے ہیں:

تو ابھی رہ گزر میں ہے، قیدِ مقام سے گزر
مصر و حجاز سے گزر، پارس و شام سے گزر
جس کا عمل ہے بے غرض، اس کی جزا کچھ اور ہے
حور و خیام سے گزر، بادہ و جام سے گزر

اقبال کے اشعار میں منزل کا تعین نہیں ہے مگر اس میں باپردہ منزل کی طرف راہنمائی بھی نظر آتی ہے۔ وہ انسان کو روایتی طریقہ کار سے ہٹ کر شاہین اور مثالی انسان کی مثال دیتے ہوئے اُس کے راستے پر چلاتے ہیں تو کبھی وہ اپنی مشہور نظم ''ہمالہ'' اور ''جوئے آب'' کا حوالہ دیتے ہوئے انسان کو اس طرف لے کر آتے ہیں۔

اے ہمالہ! اے فصیل کشورِ ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
تو جواں گردشِ شام و سحر کے درمیاں

چونکہ ندی کا پانی چلتا ہی رہتا ہے تھکنے اور رکنے کی کوئی عادت واُمید اس میں نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال ندی اور پانی کا استعارہ لے کر انسان کو اس کا درس وسبق دیتے ہیں۔اسی طرح میاں فضل حسین صاحب بیرسٹر لاہور کے نام اپنی نظم ''فلسفۂ غم'' میں بھی یہی پیغام دیتے ہیں جس میں پانی اور ندی کو مثال بنا کر پیش کرتے ہیں۔

ایک اصلیت میں ہے نہر روانِ زندگی
گر کے رفعت سے ہجومِ نوعِ انسان بن گئی

اقبال انسان کو چلنے کا اور پھر چلتا رہی رہنے کا درس دیتے ہیں۔کیونکہ اقبال کے نزدیک مسلمان کے رگوں میں توحید کی قوت ہے اور اسلام کے دیس میں یہ مصطفوی طاقت ہے۔مصطفوی قوت ختم نہیں ہوتی، یہ ازل سے ابد تک ہے۔اور اسی طرح اقبال زندگی کو جہاد کا میدان گردانتے ہوئے انسان کو تین طرح کے اسباق سے آشنا کرتے ہیں۔جن سے وہ اپنی زندگی کے سفر کو مکمل کر سکتا ہے۔لہٰذا وہ فرماتے ہیں۔

یقیں محکم ، عمل پیہم ، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں یہی ہیں مردوں کی شمشیریں

منزل کا پختہ یقین رکھ کر اس کے لیے مسلسل محنت اور محبت کو اپنا شعار بنا لینے سے زندگی کا جہاد مکمل ہوسکتا ہے۔جس کی تفصیل اقبال اپنی نظم ''اسرارِ پیدا'' میں یوں بیان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد
نہ چیز جہانِ مہ و پرویں تیرے آگے
وہ عالمِ مجبور ہے تو عالمِ آزاد
موجوں کی تپش کیا ہے فقط ذوقِ طلب ہے
پنہاں جو صدف میں ہے وہ دولت ہے خدا داد
شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُر دم ہے اگر تُو تو خطرہ نہیں اُفتاد

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں اور نہ ہی یہ راز پنہاں ہے بلکہ روزِ روشن کی طرح یہ بات آشکار ہو چکی ہے کہ کسی بھی قوم میں نوجوانوں کا کردار بہت اہم ہوتا ہے۔ وہ قوم میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت تو رکھتے ہی ہیں مگر اقبال کے نزدیک انہیں اپنی خودی کو بھی پہچاننا ہوگا۔ پھر وہ نرم دمِ گفتگو اور گرم دمِ جستجو ہو کر منزل کی طرف بڑھے گا۔ تب اشرف المخلوقات کی تکمیل ہوگی۔ اس لیے اقبال نوجوان کے ساتھ بار بار ہمیں منزل سے آگے کی بات کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی نظم ''ٹیپو سلطان کی وصیت'' میں بھی صاف اور واضح الفاظ میں نہ صرف منزل کا انکار کرتے دکھائی دیتے ہیں بلکہ اس بات کی تلقین بھی کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو روکنا مت بلکہ آگے سے آگے بڑھنے کا سامان پیدا کرنا اور نئے راستوں کی تلاش کرنا ہی انسان کا اصل خاصہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہمنشیں ہو تو محمل نہ کر قبول
اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول
کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز گرمئ محفل نہ کر قبول
صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

یہی اقبال کی منزل ہے جو وہ انسان کو ہر گھڑی نئے راستے کا متلاشی دیکھتے ہیں۔ کیونکہ انسانی فطرت کو وہ ازل سے ہی اجتہادی گردانتے ہیں۔ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ انسان مادیت کے پیچھے چلتا ہے تو وہ اپنی منزل کو دو گام پر ہی محسوس کر کے بیٹھ جاتا ہے۔ کاہلی اور سستی آڑے آتی ہے تھکاوٹ اس کا مقدر بنتی ہے۔ تب وہ اسے اپنی منزل جان کر اسی پر ہی اکتفاء کر لیتا ہے۔ نیا پن اور نئے راستے کی تلاش ختم ہو جاتی ہے۔ جس سے انسانی جدت نہ صرف ختم ہوتی ہے بلکہ وہ قدیم نظریات و خیالات میں گھر کر رہ جاتا ہے۔

جب ہم اقبال کی منزل کا تعین کرنے نکلتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اُردو شاعری کے علاوہ

فارسی شاعری کے ہر ہر شعر میں ہمیں آگے بڑھنے اور نئے راستے تلاش کرنے کا سبق ملتا ہے۔اور اقبال اس کی تلقین کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔وہ اس کے لیے تمثیلی انداز بھی اپناتے ہیں۔''پیامِ مشرق''میں اپنی مشہور نظم ''زندگی و عمل''میں انسان کو آگے بڑھنے اور نئے راستے تلاش کرنے کی تلقین یوں کرتے ہیں۔

ساحلِ اُفتادہ گفت گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم
موج ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت
ہستم گر می روم ، گر نہ روم نیستم

اب ساحل اور سمندر کی موج کے ذریعے تھک کر نہ بیٹھنے کا سبق دیتے ہیں۔موج ساحل کو کہتی ہے کہ تو ایک جگہ پر رکا ہوا ہے۔جس کا ساحل بھی اعتراف کرتا ہے کہ ہاں میں ایک جگہ پر ہی رُکا ہوا ہوں۔جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مجھے اپنا آپ بھی معلوم نہ ہوسکا۔جب کہ بیخود موج اُسے کہتی ہے:

ع ہستم گرمی روم،گرنہ روم نیستم

کہ میرا وجود بھی تب ہی ہے جب میں چلتی ہوں اگر میں رک جاؤں تب میں ختم ہو جاتی ہوں۔انسان بھی خود کو یوں محسوس کر لے تو زندگی میں نہ صرف کامیاب ہوسکتا ہے بلکہ اپنی اصل فطرت کے طور پر بھی پہچانا جا سکتا ہے۔یہ اقبال کا منزل کے بارے میں پیغام ہے اور یہی اُن کی منزل بھی۔وہ فرماتے ہیں:

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش
بہ راہِ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دستِ تو کارِ نادر آید
گناہِ ہم اگر باشد ثواب است

اقبال اپنا پیغام دینے کے لیے خوبصورت انداز اپناتے ہیں۔بہت ہی اعلیٰ سوچ وفکر لوگوں کو دینے کی کوشش کرتے ہیں۔اقبال کے نزدیک نیا کام کرنا بھی ثواب سے کم نہیں ہے۔شاید لوگوں کو نئے سے نئے کام کرنے کا کہنے کے لئے اس شعر سے بڑی بات کوئی اور نہ ہو کہ جہاں وہ گناہ کو بھی ثواب کہہ دیتے ہیں۔اگر چہ وہ نیا،انوکھا اور نادر کام ہو۔

محمد بلال

اُردو غزل ایک جائزہ

اردو ادب میں غزل ایک اہم اور مستقل صنف ہے۔ لفظ غزل کا تعلق عربی زبان سے ہے جس کے معنی عورتوں سے یا عورتوں سے متعلق عشق و محبت کی باتیں کرنا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن اپنے مضمون ''غزل اور تغزل'' میں غزل کے مفہوم کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''غزل کا لفظ عورتوں سے یا ان کے بارے میں باتیں کرنے کے معنی میں مستعمل ہے اس لیے یہ صنف بہت کچھ عشقیہ مضامین کے لیے وقف رہی ہے۔''(۱)

غزل وہ صنف سخن ہے جس میں عشق و محبت کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ اس کا دائرہ صرف داخلی کیفیات و واردات تک محدود ہوتا ہے۔ اس میں تعلّی اور خود بینی کا اظہار ہوتا ہے، معشوق کے ادب کو مدنظر رکھا جاتا ہے، اس میں سوز و گداز اور تاثیر ہوتی ہے، اس کی زبان نرم، شیریں، سلیس اور عام فہم ہوتی ہے، علم بیان اور علم بدیع کا استعمال ایک خاص حد تک ہوتا ہے، اگر درج بالا خصوصیات غزل میں ہوں گی تو غزل کا معیار بھی بلند ہوگا اور اسے اصلاً غزل بھی کہا جائے گا۔ کلاسیکی شعرا نے ان خصوصیات پر خاصی توجہ مرکوز رکھی جس کی وجہ سے ان کا کلام آج بھی زندہ ہے۔

اگر غالب کی غزل کا غائرانہ مطالعہ کیا جائے تو ان کے ہاں وہ نکات جو غزل کی جان ہیں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ ان نکات میں سوز و گداز، شیرینی و سلاست، افتادگی و تاثیر اور حقیقت نگاری وغیرہ شامل ہیں۔ غالب ادب کے جدید معماروں میں سے تھے۔ جنھوں نے نہ صرف اسلوب و ہیئت بلکہ معنویت و افادیت کے لحاظ سے بھی شاعری کا رواج بدل دیا۔ غزل کے متعلق سید مسعود حسن رضوی اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''غزل عربی زبان کا لفظ ہے مگر ایرانی شاعری کی اصطلاح ہے۔ اس کے معنی ہیں عورتوں کا ذکر کرنا۔ ان کے عشق کا دم بھرنا اور ان کی محبت میں مرنا۔''(۲)

اگر ان معانی کی روشنی میں دیکھا جائے تو غزل اس صنف کا نام ہے جو اپنے اندر واردات و کیفیات قلب جن کا تعلق حسن و عشق سے ہے کو سموئے ہوئے ہوتی ہے۔غزل کے ہر شعر کا ایک الگ اور اپنا مفہوم ہوتا ہے۔اگر عروضی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو پوری غزل ایک بحر میں ہوتی ہے اس کے پہلے شعر کو مطلع جبکہ آخری شعر کو مقطع کہتے ہیں۔ یہ دونوں حصے غزل کے انتہائی ضروری حصے ہوتے ہیں۔مطلع کے دونوں مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں اور مقطع میں شاعر اپنے تخلص کو استعمال کر کے غزل میں حسن پیدا کرتا ہے۔بعض اوقات غزل کے درمیانی اشعار میں بھی تخلص استعمال کیا جاتا ہے۔اس حوالے سے شعراء کو آزادی ہوتی ہے۔ بہت سے شعراء نے غزل میں حیات انسانی کے تقریباً سبھی پہلوؤں کو موضوع بنایا ہے۔ڈاکٹر انور صابر اپنی تصنیف ''پاکستان میں اردو غزل کا ارتقاء'' میں غزل کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''آج غزل محض غزل ہونے کے علاوہ ایک نقطہ نظر، ایک اندازِ فکر، ایک اصول تلخیص اور ایک سلیقہ اظہار کی نمائندہ صنف ہے۔''(۳)

فراق گورکھپوری نے موضوعِ غزل کے روایتی طور پر تین حصے بتائے ہیں:

۱۔معرفت وتصوف

۲۔حیات و کائنات اور اخلاقیات پر فلسفیانہ طور پر حکم لگانا

۳۔عشق مجازی

ان تینوں حصوں کے درمیان کوئی واضح حد بندی قائم نہیں ہو سکی کیونکہ موضوعات کا پیوند ایک دوسرے کے ساتھ بڑا گہرا ہوتا ہے۔غزل کی زبان اور تغزل کا انداز اس میں ہم رنگی و ہم آہنگی پیدا کر دیتا ہے۔غزل ہر زمانے میں ایک مقبول عام صنف رہی ہے۔غزل کی زبان اور اظہار دوسری اصناف ادب کے مقابلے میں زیادہ آسان اور متاثر کن ہوتا ہے۔غزل میں علم بیان و بدیع کی مختلف اصطلاحات کا خوبصورتی سے استعمال اسے اور بھی پُر اثر اور پسندیدہ بنا دیتا ہے۔بحروں کے استعمال اور دوسرے شعراء کی زمین میں شعر کہنے کی روایت نے بھی اس صنفِ ادب کو زیادہ قابلِ توجہ بنا دیا ہے۔عصرِ حاضر کے شعرا نہ صرف غزل میں روایتی حسن و عشق کے مضامین جوڑتے ہیں بلکہ معاشرتی حالات اور مذہبی و اخلاقی قدروں کو اپنے لفظوں کا حسین لباس پہنا کر لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔

اردو غزل فارسی کی مرہونِ منت ہے۔ ولی دکنی کو اردو کا پہلا باقاعدہ غزل گو شاعر تصور کیا جاتا ہے۔ اسے غزل کا بابائے آدم بھی کہا جاتا ہے۔ غزل کے دو دبستانوں کا ذکر ملتا ہے۔ ایک دبستان لکھنوی اور دوسرا دبستان دہلوی ہے۔ انشاؔ، جرأتؔ اور ناسخؔ لکھنوی دبستان کے نمائندہ شعرا ہیں جبکہ میرؔ، دردؔ، شیفتہؔ اور ظفرؔ دہلوی دبستان کے نمائندہ غزل گو شعرا ہیں۔ لکھنوی دبستان کے شعراء کے ہاں اشعار میں فحش اور بازاری انداز بھی ملتا ہے۔ اردو غزل کا مستقبل انتہائی روشن اور قابلِ تحسین ہے۔ اس صنف میں نئے نئے تجربات اور اسلوب کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔ غزل کے دو مصرعے نہ صرف تخیل کو جذب کر لیتے ہیں بلکہ ذات سے لے کر کائنات تک، انفس سے لے کر آفاق تک، احساسات سے لے کر تاثرات تک، عمیق کیفیات سے لے کر فلسفیانہ تفکرات تک تمام زاویوں اور گوشوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں۔

غزل کی آغوش ہر انسانی مشاہدے اور تجربے کی کفیل ہے اور اس کے کینوس پر ہر طرح کی گلکاری کی جاسکتی ہے۔ غزل انسانی جذبوں کی پناہ گاہ اور سماجی رویوں کی تربیت گاہ ہے۔ غزل ہر عہد کے جذباتی، روحانی، تہذیبی، سیاسی اور سماجی آشوب کی کمپیوٹرائزڈ شکل ہے۔

گذشتہ نصف صدی کے دوران پاکستان میں لکھی جانے والی غزل اپنے مزاج، اسلوب، لفظیات، علامات، تشبیہات، استعارات اور تناظر کے لحاظ سے منفرد پہچان کی حامل ہے۔ قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک غزل مختلف مراحل سے گزر چکی ہے۔

غزل کی ایک خاص خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں حد درجے کی دور بینی پائی جاتی ہے۔ غزل گو جو کچھ کہتا ہے اپنے آپ میں ڈوب کر کہتا ہے۔ غزل کی زبان اور اظہار دوسری اصنافِ ادب کے مقابلے میں زیادہ آسان اور متاثر کن ہوتا ہے۔ عموماً غزل میں حسن وعشق کی مختلف کیفیات کا بیان ہوتا ہے۔ تاہم غزل میں اتنی وسعت، رنگا رنگی اور تنوع ہے جتنی کائنات خود متنوع اور وسیع ہے۔ اسی ہمہ گیری کے سبب غزل میں مذہبی، سیاسی، معاشرتی، تہذیبی، اخلاقی، فلسفیانہ، حکیمانہ اور عاشقانہ موضوعات وسائل پر اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ یوں معنی کے لحاظ سے غزل میں بڑی لچک ہے اور اس کی مقبولیت کا راز بھی یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کا مستقبل انتہائی شاندار اور متاثر کن دکھائی دیتا ہے۔ غزل کے مستقبل کے بارے میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی رائے ملاحظہ ہو:

''اردو غزل کا مستقبل شاندار اور روشن ہے کیونکہ اس میں بڑی تغیر پذیر اور لچک موجود ہے۔اس سلسلے میں اردو ادب کے ایک نقاد شمیم احمد نے بڑی پتے کی بات کہی ہے کہ اگر اردو شاعری کبھی زندہ رہی تو غزل کے ساتھ زندہ رہے گی۔لوگ خواہ کتنے ہی دعوے کیوں نہ کریں اور نظم میں چاہے جتنا بڑا ذہن چلا جائے لیکن کوئی آدمی تنہائی میں کوئی شعر گنگنائے گا تو وہ غزل ہی کا ہوگا نظم کا نہیں۔''(۴)

ڈاکٹر عبدالاحد اپنی کتاب ''اردو غزل کے پچاس سال'' میں لکھتے ہیں کہ:

''عربی ادب میں غزل نے کوئی مخصوص صنفِ سخن بن کر امتیازی صورت اختیار نہیں کی۔۔۔اور بالآخر ایک مخصوص لطیف و نظیف صنفِ سخن کے مفہوم کے لیے پختہ تر اور واضح ہوتا گیا اور بذاتِ خود ایک ادبی دنیا بن گیا۔''(۵)

غزل کی دو بڑی حیثیتیں ہیں ایک تو اس کا تعلق موسیقی سے ہے۔قول و غزل موسیقی کی معروف اصطلاحیں ہیں۔غزل کا اولین اصطلاحی سراغ قدیم ساسانی دور کے خسرو پرویز کے درباری گائیک کے حوالے سے ملتا ہے۔اس نے ۳۲۰ راگنیاں ایجاد کیں۔انہی میں ایک کا نام غزل ہے۔حضرت امیر خسرو نے اپنی ایجاد کردہ راگنیوں میں سے ایک کا نام غزل رکھا ہے۔

غزل کی ایک اور حیثیت قصیدے کے طور پر سامنے آئی ہے۔اس اصطلاح کی مختلف سطحوں پر تشریح کی جاتی رہی۔اگر تغزل کو فارسی کے حوالے سے جانچا جائے تو اس سے مراد وہ لطیف پیرایہ ہے جس سے قصیدے کا آغاز ہوتا ہے۔اسی قصیدے کو بعض اوقات غزل کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔

غزل کی اصلی اور محکم روایت ایران سے ملتی ہے۔جو فارسی زبان میں لکھی گئی۔مغلوں کے ہندوستان آنے سے پہلے شاعری میں گیت کا آہنگ ملتا ہے۔جب مغل ہندوستان آئے تو وہ اپنے ہمراہ صنفِ غزل بھی لائے۔جس سے متاثر ہو کر ہندوستانی شعرا نے اپنی شاعری کو گیت سے غزل کی طرف منتقل کیا۔

اردو غزل فارسی غزل کے زیرِ اثر پروان چڑھی ہے۔پہلے پہل اس کی نمود دکن میں ہوئی۔دکن کی ادبی زمین میں اس نے جڑ پکڑنا شروع کر دی تھی مگر اس پر برگ و بار شمالی ہند میں آئے اور یہیں یہ شجر سایہ دار بنی۔دکن میں ولی دکنی اس میں اپنا نام پیدا کر چکے تھے۔شمالی ہند میں

پہلے ایہام گوئی نے جنم لیا مگر بعد میں میرؔ، سوداؔ اور دردؔ کے ہاتھوں اس صنف ادب کو مقامِ عروج حاصل ہوا۔ اسی دور کو غزل کا سنہری دور یا زریں دور بھی کہا جاتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر محمد حسن، غزل اور تغزل، مشمولہ: فنون، سہ ماہی شمارہ ۱۔۲، جلد ۵، اکتوبر نومبر ۱۹۶۴ء، ص ۲۲۳

۲۔ سید مسعود حسن رضوی، صنفِ غزل پر ایک تحقیقی نظر، مشمولہ: نگار، فروری ۱۹۶۴ء، ص ۱۰۳

۳۔ ڈاکٹر انور صابر، پاکستان میں اردو غزل کا ارتقاء، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۲ء، ص ۲۳

۴۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، اصناف ادب، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۳۶

۵۔ ڈاکٹر عبدالاحد، ردو غزل کے پچاس سال، دہلی: مکتبہ کلیاں، ۱۹۴۱ء، ص ۱۹

زینب زاہد

اُردو نظم کا ارتقاء

نظم کا لفظ مختلف سلسلوں میں مختلف معانی میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ نظم کے معانی جس طرح موتیوں کو پرو کر ہار بنایا جاتا ہے بالکل اسی طرح خیالات کو ترتیب دے کر نظم بنائی جاتی ہے۔ احتشام حسین اُردو نظم پر تنقیدی نظر میں لکھتے ہیں:

''جب نظم کا لفظ شاعری کی ایک خاص صنف کے لیے استعمال ہوتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے اشعار کا ایسا مجموعہ جس میں ایک مرکزی خیال ہو اور ارتقائے خیال کی وجہ سے تسلسل کا احساس پیدا ہو سکے۔''(۱)

جہاں تک اُردو میں نظم گوئی کا تعلق ہے عام خیال یہ ہے کہ اس کی ابتدا عہد جدید میں ہوئی۔ اگر ہم شعوری طور پر ایک صنف شاعری کو ترقی دینے کا خیال کریں تو یہ بات غلط نہیں ہے لیکن اگر نظم نگاری کی روایت کی جستجو کریں تو اس کی تاریخ کم و بیش وہی ہوگی جو اُردو شاعری کی ہے۔

اُردو کے پہلے نظم گو شاعر امیر خسرو ہیں۔ سب سے پہلے دکن میں اُردو شاعری کی ابتدا ہوئی جہاں مختصر مثنویوں کی شکل میں مذہبی یا صوفیانہ نظمیں ملنے لگیں۔ امیر خسرو کے بعد سلطان محمد قلی قطب شاہ نے ایسا کام کیا جسے نظموں کے سوا کچھ اور کہنا مناسب نہ ہوگا۔ ان کا زمانہ ۱۲۰۰ء کے قریب کا ہے۔ اس کی زبان کی ہندوستانیت، موضوعات کی مقامیت اور جوشِ اظہار قلی قطب شاہ کو اُردو کے اعلیٰ شعرا کی صف میں شمار کرواتا ہے۔

اسی دور میں کربلا کے حوالے سے بہت سی نظمیں لکھی گئیں جو موضوع کے اعتبار سے تو مرثیہ ہیں لیکن ان کو اگر نظموں میں شامل کیا جائے تو مناسب نہ ہوگا۔

شمالی ہند خصوصاً دہلی میں اُردو نظم کا آغاز سترھویں صدی اور اٹھارویں صدی کے ابتدائی سالوں میں ہوا۔ اس سلسلے کے سب سے اہم شاعر افضل جھنجھانوی ہیں۔ آٹھویں صدی / چودھویں

صدی عیسوی میں جب اُردو نظم کا مرکز جنوبی ہند منتقل ہوگیا تو اُردو نظم وہاں چار سو سال تک پرورش پاتی رہی۔

ہریانہ، پنجاب، گجرات اور دکن کے علاقہ میں کچھ اور شعرا کے نام بھی نظر آتے ہیں جنھوں نے مثنوی کے انداز میں نظمیں لکھی، لیکن شمالی ہند میں باقاعدہ اردو نظم کا آغاز فرخ میر اور محمد شاہ کے دور سے شروع ہوا۔ متعدد شعرا نے فارسی کو ترک کر کے اُردو میں لکھنا شروع کیا۔ ڈاکٹر منور نے حاتم کو دہلی کا پہلا اُردو شاعر قرار دیتے ہوئے کہا:

''وہ ایک اچھے غزل گو ہونے کے علاوہ ایک اعلیٰ پائے کے نظم گو بھی تھے۔''

اگر ہم تاریخی اعتبار سے آگے بڑھیں تو اُردو شاعری میں سودا اور میر کا دور سامنے آتا ہے۔ سودا اور میر کا دور اُردو شاعری کے وسیع اور بلند ہونے کا دور ہے۔ تقریباً اسی دور میں غزل، قصیدہ، ہجو اور مثنوی نے اپنی ایک منفرد شناخت قائم کی۔

ابتدا میں ان اصناف کو بہت بلندی ملی لیکن جلد ہی نظیر اکبر آبادی نے بغیر کسی کا سہارا لیے نظم نگاری کو پروان چڑھایا۔

سودا اور میر نے مخمسوں، شہر آشوبوں، مثنویوں اور ہجواں کی شکل میں مختلف مسائل حیات پر بہت سی خوبصورت نظمیں لکھی۔ اس نے انفرادی، اجتماعی، داخلی، خارجی، فطری، سماجی، تاثراتی، فلسفیانہ سبھی مسائل پیش کیے۔ ان نظموں میں وحدتِ تاثر اور تعمیری حسن بھی ہے۔ ان نظموں میں فنی تجربے نہ ہونے کے برابر کیے گئے۔

ایک نئی روایت کی ابتدا نظیر اکبر آبادی نے کی انھوں نے نظم نگاری کو غزل گوئی پر ترجیح دی۔ انھوں نے نظموں کو اپنی شخصیت اور اپنے عہد کی ترجمانی کا ذریعہ قرار دیا۔ انھوں نے عشق، مذہب، رسم، کھیل کود، تفریحات، فلسفہ، بچپن، جوانی، بڑھاپا الغرض ہر موضوع پر نظمیں لکھی۔ نظیر نے نظموں کی ہیئت پر خاص تجربے نہیں کیے۔

نظیر کے انتقال کے بعد نظم کی دنیا میں خاموشی سی چھا گئی۔ اُردو نظم کی ڈاوڈول کشتی کو سہارا دینے کے لیے انہی حالات کے زیرِ اثر نظم نگاری کی تحریک شروع ہوئی اور غزل کے مقابلے میں نظم کو اہمیت دینے کی مہم کا آغاز ہوا۔

نئے حالات میں نظم کی جس تحریک کا آغاز ہوا اس کی پہلی عملی اور شعوری شکل لاہور کی

انجمن پنجاب تھی۔ جس کی بنیاد مولانا محمد حسین آزاد نے کرنل ہالرائڈ کے مشورے سے ڈالی۔ آزاد نے اس تحریک کی ابتداء ۱۸۶۷ء میں کی۔ یہ تحریک غالباً پہلی شعوری ادبی تحریک کی حیثیت رکھتی ہے۔ مئی ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب نے مصرع کی بجائے موضوعات پر نظمیں لکھ کر مشاعروں میں شرکت کا اعلان کیا۔ لاہور میں ایسے کئی مشاعرے ہونے لگے جس میں مولانا حالی نے بھی شرکت کی۔ ان مشاعروں کا سلسلہ بعد میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک منظّم تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے مقامات پر بھی ایسے مشاعروں کا آغاز ہوا۔ اس وقت کے اخباروں رسالوں میں اس کی روداد یں شائع ہونے لگی۔ بعض نئے مقامات پر اس نئے اقدام کی مخالفتیں بھی ہوئیں۔ دہلی اور خاص کر لکھنؤ میں اس کی مخالفت زور پکڑ گئی۔

محمد حسین آزاد کے بعض موضوعات شاعری کے اس دائرے میں آتے ہیں جنہیں اس عہد کی نیچرل شاعری کہا جاتا ہے۔ حالؔی کی اکثر منظومات مسدس، قطعات وغیرہ پر اس تحریک کا اثر ہے۔ اس تحریک نے نظم کی ہیئت میں زیادہ تبدیلیاں نہیں کی۔ ہیئت میں تبدیلی جلد از جلد نہیں ہوتی جبکہ اسلوب، انداز، رموز اور علامات میں تبدیلیاں کرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔

آزاد اور حالی کے علاوہ نذیر احمد، مولانا ذکاء اللہ اور بعض دوسرے علماء بھی نظم نگاری کی طرف مائل ہوتے کیونکہ انہیں اس صنف کی افادیت کا احساس تھا۔ اس عہد میں اسمٰعیل میرٹھی، مولانا شبلی نعمانی، اکبر الہ آبادی، سرور جہاں آبادی، نادر کاکوروی اور پھر بہت دور ہٹ کر چکبست، اقبال، شوق قدوائی، ظفر علی خاں وغیرہ نے نظم گوئی کا علم کچھ اس طرح بلند کیا کہ زندگی کے تقریباً تمام اہم پہلو شاعری میں جگہ پا گئے۔ ان شعرا نے نظم سے رسمی اور غیر رسمی، روایتی اور انقلابی بہت سے کام لیے۔

قومی تصورات ہی نہیں بین الاقوامی سوجھ بوجھ بھی بیدار ہو چکی تھی لیکن اندازِ نظر سیاسی کم اور اخلاقی زیادہ تھا۔ انہیں خیالات کے سایہ میں رومانی رنگ بھی اپنی جگہ بنا رہا تھا۔ رومانی تحریک میں خوشی محمد، نادر کاکوروی، اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی اور اقبال کا نام زیادہ اہم ہے۔ اقبال کی شاعری قومی اور رومانی ہے۔ اکثر ایک خیال پیش کیا جاتا ہے کہ انیسویں صدی کا کوئی شاعر ایسا نہ ہو گا جو رومانیت کے افسوں کا شکار نہ ہوا ہو اور جس نے اس کی پکار پر لبیک نہ کہا ہو۔ یوں تو رومانیت ہر موضوع کے انتخاب اور اظہار میں اپنی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس تحریک کی خوبصورت نمائندگی

جوش، ساغر، حفیظ، اختر، عظمت اللہ خاں روش، اختر انصاری، احسان دانش، فراق، جمیل کی بہت سی نظموں میں ہو جاتی ہے۔ یہاں عورت محبوبہ ہے، بے نقاب اور بے حجاب ہے۔ اس کا ذکر بھی بے باک ہے۔ وہ حقیقتوں کا ساتھی ہے۔

یہ شعراء زندگی کے ٹھوس اور سنگین حقائق کا ادراک کرتے ہیں۔ ان شعراء پر زندگی کی حقیقت جتنی زیادہ کھلتی ہے اسی قدر ان کے رومانی اندازِ نظر میں نئے فکری عناصر شامل ہوتے ہیں۔ ان شعراء نے سیاسی جدوجہد اور اخلاقی اقدار کو موضوع بنایا۔ عروضی پابندیوں کے اندر ہیئت کے حوالے سے بھی تجربات کیے گئے۔

اقتصادی بدحالی، معاشی ناانصافی، سیاسی انقلاب پسندی اور فکری انتشار کے بطن سے ترقی پسندی کی تحریک جنم لیتی ہے۔ جس نے زندگی اور ادب کے تعلقات کو قائم کیا۔ جس نے زندگی اور ادب کے تعلقات کو قائم کیا۔ اس تحریک کا آغاز ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ یہ تحریک باقاعدہ ادبی منصوبہ بندی کے ساتھ میدانِ ادب میں اتری۔ جس کا مقصد ادب اور زندگی کے درمیان رشتوں کو استوار کرنا تھا۔ اس تحریک کے نمائندہ شاعروں میں اسرار الحق، علی سردار جعفری، جوش ملیح آبادی اور فیض شامل ہیں۔

ترقی پسندی کی تحریک ہر نئی تحریک کی طرح اپنے سوا ہر چیز کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ ورنہ ہمارے ادبی سرمائے میں ترقی پسند عناصر برابر کام کر رہے ہیں اور کسی بھی زمانے میں انہیں کوئی کچل نہیں سکا ہے۔

اس تحریک نے مزدوروں، کسانوں اور عام آدمی کے مسائل کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔ فرمان فتح پوری ''اُردو شاعری کا فنی ارتقا'' میں لکھتے ہیں:

> ''اس نے قحط سالی کا عکس پیش کیا جو عشق کو بھی بھلا دے۔ اس نے ادب میں عوام اور جمہور کے دل میں دھڑکن بیدار کی ہے۔ یہ اگرچہ بہت کچھ مغرب کی خوشہ چینی کرتی ہے مگر بحیثیت مجموعی مغرب سے ہم ابھی بہت کچھ لے سکتے ہیں۔ اس نے سیکڑوں بے زبان لوگوں کو بولنا اور لکھنا سکھایا ہے۔''(۲)

اس تحریک کے بہت سے شعر انظم کی حدوں کو وسیع کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

اُردو نظم نگاروں کا یہی ایک قافلہ نہیں تھا جو اُردو نظم کو حقیقت نگاری کے بامِ عروج پر لے

جا رہا تھا بلکہ اس گروہ کے ساتھ ایک اور گروہ ترقی پسند تحریک کے پیراہل حلقہ اربابِ ذوق کے نام سے اُبھرا۔ یہ تحریک ۱۹۳۹ء میں بزمِ افسانہ گویاں کے نام سے شروع ہوئی اور پھر اس بزم کا نام حلقہ اربابِ ذوق رکھ دیا گیا۔ اس تحریک کے شعرا نے مسائل بیان نہیں کیے بلکہ یہ بتایا ہے کہ نظم کو کس طرح خوبصورت بنایا جائے۔ اس میں کس طرح کے استعارے شامل کیے جائیں۔ شاعری کو کس انداز میں بیان کیا جائے۔ اس گروہ میں شامل بہت سارے شعرا میں سے چند ایسے بھی شعرا تھے جنھوں نے نظم کو نئی دنیا میں پہنچا دیا۔ حلقہ اربابِ ذوق کے شعرا میں میراجی، ن م راشد، وقار صدیقی، قیوم نظر اور یوسف ظفر زیادہ اہم ہیں۔

ڈاکٹر طارق ہاشمی ترقی پسند تحریک اور حلقہ اربابِ ذوق کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ترقی پسند تحریک اور حلقہ اربابِ ذوق دو ایسی تحریکیں ہیں جنھوں نے اُردو ادب کو نہ صرف فکر کی نئی جہات سے آشنا کیا بلکہ اُردو نظم میں ہیئت واسلوب کے حوالے سے قابلِ قدر تجربات بھی کیے۔''(۳)

حوالہ جات

۱۔ احتشام حسین، اُردو نظم پر تنقیدی نظر، پاکستان انجمن ترقی اُردو، ۱۹۸۰ء، ص ۴۸

۲۔ فرمان فتح پوری، اُردو شاعری کا فنی ارتقاء، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء، ص ۱۳۸

۳۔ طارق ہاشمی، ڈاکٹر، جدید نظم کی تیسری جہت، فیصل آباد: شمع بکس، ۲۰۱۴ء، ص ۸۲

حافظ عامر شہزاد

نفاذِ اُردو عصری ضرورت

ابتدائے آفرینشِ انسان ہی سے زبان کا آغاز ہوا۔ بہت سی زبانیں وجود میں آئیں اور رفتہ رفتہ تاریخ کے گمشدہ اوراق کا حصہ بن گئیں۔ اس کی بڑی وجہ یا تو ان زبانوں کے بولنے والے نہ رہے یا وہ وقت اور حالات کے تقاضوں پر پورا نہ اُتر سکیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ جس قوم نے اپنی زبان سے محبت کی اسے تقویت اور عروج ہی ملا۔

''جدید تحقیق کے مطابق: دنیا میں موجود ۷۰۰۰ زبانوں میں سے کئی سو ختم ہو چکی ہیں اور اس صدی کے آخر تک بڑی زبانوں کی اجارہ داری کی وجہ سے بہت سی زبانیں دم توڑ جائیں گی۔''

اُردو زبان چار صدیوں سے اپنے ارتقائی سفر کی جانب تیزی سے گامزن ہے اور یہ نہ صرف تیزی سے مقبولیت حاصل کر رہی ہے بلکہ وقت اور حالات کے مطابق ہر طرح کی تبدیلی اور تغیر کو اپنے اندر ضم کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ اُردو ہی ہے جس نے قدیم زبانوں کو نہ صرف پیچھے چھوڑا بلکہ کرہ زمین پر جہاں بھی انسانی وجود قائم ہے وہاں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اقوامِ متحدہ کے ادارہ یونیسکو کے ایک سروے کے مطابق دنیا بھر میں بولی اور سمجھی جانے والی زبانوں میں انگریزی اور چینی کے بعد یہ تیسری بڑی زبان ہے۔

اُردو کی پہلی نثری کتاب ''سب رس'' ۱۰۴۵ھ میں تخلیق ہوئی۔ اُردو کی ترقی وفروغ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سترھویں صدی سے اب تک (اکیسویں صدی کے ابتدا تک) ہر موضوع، ادب، تاریخ، سیرت، فقہ، تفسیر، منطق، فلسفہ وغیرہ پر نہ صرف ہزاروں بلکہ اگر یوں کہوں کہ لاکھوں کتابوں تک تعداد پہنچ چکی ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ یہ وہی اُردو ہے جس کے بطن میں غالب، میر تقی میر، سودا، سرسیّد، حالی، شبلی، جوش، اقبال، فیض احمد فیض، قتیل شفائی جیسی پُر وقار

شخصیات موجود ہیں جن پر اُردو کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ جنہوں نے دنیا میں اپنے فکر و فن سے اُردو کو متعارف کروایا۔ ڈاکٹر طارق ہاشمی کا قول قابل اعتبار سمجھا جا سکتا ہے۔

''یہ صرف اُردو ہی وہ واحد سبجیکٹ ہے جس پر ہر ادیب درجن بھر کتابیں لکھ دیتا ہے۔''

اور ڈاکٹر رشید حسن خاں بھی اُردو کی مقبولیت اور نوجوانوں کا اُردو کی طرف رجوع دیکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہماری یونیورسٹیاں تحقیقی مقالوں کے کارخانوں کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔''

اُردو ہماری تہذیب و ثقافت کا ایک مضبوط نشان ہے اسلام اور اس کے جملہ احکامات کا ہم تک پہنچنے میں اُردو کا ایک بہت ہی خاص اور اہم کردار ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اُردو ہماری تعلیم و تربیت میں جس قدر مضبوط انداز میں کردار ادا کر سکتی ہے۔ وہ انگریزی یا کوئی اور زبان نہیں کر سکتی۔ قیامِ پاکستان کے عمل میں بھی اُردو کا جو حصہ ہے اسے فراموش نہیں کیا سکتا۔ قیامِ پاکستان کے وقت قائداعظمؒ نے بھی تو یہی فرمایا تھا:

''پاکستان کی سرکاری زبان اُردو اور صرف اُردو ہوگی۔''

اُردو ہماری قومی زبان تو ہے لیکن پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد آج تک جو حشر اس کے ساتھ ہو رہا ہے وہ سب پر عیاں ہے۔ پاکستان ہی وہ واحد ملک ہے کہ جس میں Uper Class کے لوگ اُردو بولنا اور لکھنا معیوب سمجھتے ہیں۔ قدرت نے ملک تو آزاد دے دیا لیکن غلامانہ ذہنیت آزاد نہ ہو سکی۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کوئی قوم اپنی زبان کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی۔ بدقسمتی سے ۷۰ سال سے برسر اقتدار طبقہ مغرب زدہ ذہنیت کا حامل رہا ہے اور اُردو کو صرف اس لیے قبول نہیں کر رہا کہ یہ جدید علوم و فنون، سائنس و ٹیکنالوجی سے محروم ہے۔ اس لیے کسی صورت قوم کی رہنمائی نہیں کر سکتی۔ لیکن کیا جاپان، فرانس، روس، چین اور دیگر ممالک میں انگریزی اسی حالت میں موجود ہے؟ اور کیا یہی ممالک سائنس و ٹیکنالوجی میں انگریزی طبقات سے پیچھے ہیں؟ ہرگز نہیں۔

ہمارے ملک میں رائج دوہرا معیارِ تعلیم کبھی ہمیں اپنی زبان سے محبت نہیں کرنے دے گا یہ نہ صرف نسلِ نو میں احساسِ کمتری پیدا کر رہا ہے بلکہ مذہب اور قومی مشاہیر کو بھی نگاہ بیگانگی سے دیکھتا ہے۔ ہم سائنس دان اور ٹیکنالوجیسٹ کیوں نہ پیدا کر سکے اس لیے کہ کسی مسئلے کو گہرائی میں سمجھنا یا دماغ کا یکسوئی سے مسئلہ کا کھوج لگانا ہوتا ہے اور یہ صرف اور صرف اپنی زبان میں ہوتا ہے۔

ایسے حالات میں قومی درد دِل رکھنے والے چیف جسٹس جواد ایس خواجہ کا اُردو کے نفاذ کا بیان انتہائی خوش آئند ہے۔ اسی طرح کے نفاذِ اُردو کے بیان کو دیکھنے کے لیے ہمارے بزرگوں کی آنکھیں ترستی رہیں۔ چیف جسٹس جواد ایس خواجہ کو تاریخِ اُردو سنہرے باب میں قلم بند کرے گی لیکن ہمیں ڈر ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ اس کو بھی دیگر فیصلوں کی طرح ہوا میں نہ اُڑا دیں۔

ایک بڑا خداشہ جو نظر آ رہا ہے وہ اُردو رسم الخط نستعلیق کو بدل کر رومن کر دینے کا ہے۔ ہمیں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ جس اشرافیہ نے طاقت کے بل بوتے پر ۷۰ سال تک اُردو کا نفاذ نہ ہونے دیا وہ اگر رسم الخط رومن کر دے تو بھی ان کو کوئی پوچھنے والا نہ ہوگا۔ ان کے پاس بھی دلائل ہیں، طاقت ہے، میڈیا ہے۔

سوشل میڈیا کے مطابق 2 کروڑ پاکستانی فیس بک، ٹویٹر، سکائپ وغیرہ استعمال کرتے ہیں اور اپنے پیغامات رومن خط میں رسیو اور سینڈ کرتے ہیں پھر موبائل پر بھی رومن خط کا استعمال ہوتا ہے۔ اس بات میں شک نہیں کہ آج دو کروڑ ہیں بیس سالوں تک یہ تعداد آٹھ یا دس کروڑ تک پہنچ جائے گی تو اندازہ لگائیے جب نوجوان نسل کو سارے علوم وفنون نیٹ سے ملیں گے تو رومن کے نفاذ کے لیے کلاسیکی ادب، تاریخ، فقہ، سیرت وغیرہ تمام موضوعات کو نہیں دیکھا جائے گا۔ خدا نہ کرے ایسا ہو لیکن ایسا ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔

ہمارے بہت سے سکولز انگلش میڈیم ہیں، کالجز اور یونیورسٹیز میں صرف 5% اُردو اور تمام تر سبجیکٹ انگلش میں ہیں تو پھر بتائیے نوجوان نسل کس کے ساتھ ہوگی؟

ایک المیہ یہ بھی ہے کم و بیش تمام تر سیاسی پارٹیز کے ایجنڈے میں اُردو کے نفاذ کا پوائنٹ ہی شامل نہیں۔ کبھی وقت تھا کہ ہمیں اُردو کی اشد ضرورت تھی لیکن آج اُردو کو ہماری سخت ضرورت ہے وہی اُردو جس نے تعلیم، مذہب، تربیت، شناخت حتیٰ کہ ہمیں ملک دیا لیکن ہم اُردو سے علمی و عملی زندگی میں کس حد تک پیار اور اسے ترجیح دیتے ہیں یہ سوالیہ نشان ہم پر ہے؟

آخر میں اس شعر کو ترمیم کے ساتھ پیش کرتا ہوں:

اپنی زبان سے ہٹو گے تو دور نکل جاؤ گے
خواب بن جاؤ گے افسانوں میں ڈھل جاؤ گے
اپنی مٹی پہ چلنے کا سلیقہ سیکھو
سنگ مرمر پہ چلو گے تو پھسل جاؤ گے

خورشید راضیہ

اردو ادب کا درخشندہ ستارہ
(شبلی نعمانی)

انیسویں صدی ہندوستانی تہذیب کا زوال اور انگریزی عمل داری کے غلبے کی صدی ہے۔ یہ وہ دور تھا جب انگریزی تہذیب کے اثرات ایک ناسور بن گئے اور معاشرے کی اخلاقی رگ و پے میں تیزی سے سرایت کر رہے تھے۔

لوگوں کی سماجی، تہذیبی، سیاسی اور مذہبی زندگی ان اثرات کو تیزی سے اپنے اندر سمو رہی تھی اور منفی اثرات مرتب کر رہی تھی۔

مسلمانوں کے اندر نیا جذبہ نئی روح معاشرے میں بیداری پیدا کرنے کیلئے ایک مرد مومن اٹھا اور قلم سے نئے روزن واء کئے۔

محمد شبلی نعمانی (1857-1914ء) شوال المکرّم 1273ھ بمطابق جون 1857 میں پرگنہ سکٹری کے قصبے بندول میں ایک متوسط خاندان میں پیدا ہوئے۔ اس وقت 1857 کی جنگ آزادی کا ہنگامہ چاروں طرف برپا تھا۔

آپ کے والد شیخ حبیب اللہ جو کہ پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے نسلاً راجپوت تھے عوام کی فلاح و بہود کے لیے کوشاں تھے آپ نے اپنے بیٹے کا نام شبلی بغدادی کے نام پر شبلی رکھا جس میں بیٹے نے بعد میں نعمانی کا اضافہ کیا اور 1857 سے لیکر آج تک شبلی نعمانی کے نام سے ہی جانے جاتے ہیں۔

ابتدائی تعلیم دینی مدرسے اپنے گاؤں سے ہی حاصل کی۔ 1308ھ تا 1890ء مولوی شکر اللہ سے تعلیم حاصل کی۔ 1315ھ تا 1897ء مدرسہ عربیہ میں بھی درس لیا۔ تعلیم کے بعض مراحل کو فاروق چڑیا کوٹی کے پاس بھی طے کیا ان کے استاد کا ان پر گہرا اثر ہوا فاروق چڑیا کوٹی غازی پور

میں درس دیا کرتے تھے۔ بقول شبلی:

''میں نے معقولات کی تمام کتابیں مثلاً میر زاھد، میر جلال، مع میر زاھد احمد اللہ و شرح مطالعہ شمش بازغہ ان ہی سے پڑھیں۔''

مولانا فاروق احمد نہ صرف عملی تعلیم دیتے بلکہ نسب اربع قضایا اور اشکال کی باقاعدہ مشق کراتے تھے آپ نے منطقی اور فلسفی ذہن انہی سے پایا۔ مزید تعلیم 1291ھ میں رام پور 1292ھ میں لاہور گئے۔ فیض الحسن سہارنپوری سے علم الادب پڑھا۔ 19 برس تک تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد 1872 میں والد کے ساتھ سفر حج کیا اور بعد میں لاء کی تعلیم حاصل کی۔ والد کے تیل کے کام میں بھی مدد کرتے رہے۔ 1877ء میں مولانا افغانی کی ''تحریک اسلامی'' میں بھی شرکت کی۔ روس اور روم کی جنگ میں چندہ دے کر مدد بھی کی۔ عربی اور فارسی میں تھوڑا عرصہ شاعری کی۔ اردو میں تسنیم اور فارسی میں شبلی تخلص اختیار کیا۔ والد کے کہنے ہر وکالت کی پر دِل نہ لگا۔ اسلام شبلی کی ترجیحات میں سرفہرست رہا۔ اسلامی اصولوں پر کبھی سمجھوتہ اختیار نہیں کیا۔ مسلمانوں کی ابتر حالت دیکھتے ہوئے ندوۃ العلماء قائم کی تاکہ مسلمانوں کا شاندار ماضی سامنے آسکے انہوں نے مشرق و مغرب کے اساتذہ کو ملا کر ایک مقام پر تعلیم و تدریس کی اشاعت کی۔ یہ برصغیر کا پہلا ادارہ تھا جہاں مشرق و مغرب کا امتزاج ملتا تھا۔ علی گڑھ کالج ایک چمکتا ستارہ تھا۔ برصغیر کا جہاں دو قوموں کا امتزاج بھرپور طریقے سے پنپتا ہوا نظر آتا تھا۔

1892 میں روم اور شام کا سفر کیا اور سفر نامہ دوستوں کے اصرار پر قلم بند کیا اور لکھا کہ مسلمانوں کی حالت ہندوستان کے مسلمانوں جیسی ہے۔ 1894 کو ان کی تخلیقی خدمات کے صلے میں ان کو شمس العلما کا خطاب ملا۔ 1895 میں شبلی لاہور آ گئے انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں شرکت کی۔ اور اسی سال آلہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ فنون اور بورڈ آف اسٹڈیز کے رکن مقرر ہوئے۔ شبلی انگریزوں کے خلاف کھلم کھلا اظہار کرتے تھے یہ بات انگریزوں کی آنکھ میں کھٹکتی تھی۔ 1896 سے 1897 تک سال کی رخصت لی اور عزم گڑھ میں آ کر الفاروق پر کام شروع کر دیا۔ 1897 میں ہی ان کے بھائی مہر حسن کی وفات ہوگئی یہ صدمہ ان کے لئے بہت گہرا تھا۔ رخصت ختم ہونے پر مدرسے آ گئے 15 سال کالج سے وابستہ رہے۔ جون 1900ء میں انہوں نے عقد ثانی کیا پہلی بیوی کی وفات کے بعد اسی سال ان کے والد محترم کا بھی انتقال ہوگیا۔ 1909 میں ندوۃ العلما

ء آ گئے اور 1913ء تک تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔شبلی پر لکھنے والوں نے ان کی عطیہ فیضی کے ساتھ عقیدت و محبت کو چھپانے کی اکثر کوشش کی ہے لیکن یہ ان کی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے یہ وہ عقیدت تھی جو ان کی فارسی کی شاعری میں نظر آتی ہے اور وہ اپنی فارسی غزلوں کے مجموعے ''بوئے گل''اس عقیدت کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

بامایہ پر معاملہ بدگمان نہ بود

جوش بود آں راز محبت عیاں نہ بود

شبلی نعمانی 17 مئی 1907ء کو ایک المناک حادثے سے دوچار ہوئے جس نے ان کی زندگی کا رخ ایک نئے دھارے کی طرف موڑ دیا۔ان کی اپنی بھری بندوق جو تخت پر پڑی تھی اس کا گھوڑا دب جانے کی وجہ سے گولی ٹخنے کو چور کرتی ہوئی آر پار ہوگئی اور ان کو ایک پاؤں مصنوعی لگوانا پڑا۔اس کے بعد انہوں نے تصنیف و تالیف کے کام پر اپنی توجہ مرکوز کر دی اور سیرت النبی لکھنے کا ارادہ کیا۔1914 میں دارالمصنّفین بنایا۔اپریل تا جون دہلی میں رہے اور سیرت النبی کی اول جلد کی تکمیل میں لگ گئے۔15 اگست 1914 کو بھائی محمد اسحاق بھی اللہ کو پیارے ہوگئے اور آپ اعظم گڑھ واپس آ گئے۔شکر،ضعف معدہ،السر،خونی،پیچش وغیرہ کے امراض سے لاغر ہوگئے بہت علاج کرایا لیکن جانبر نہ رہ سکے۔آخری لمحات میں اپنے ہونہار شاگرد سید سلمان ندوی کو بلایا ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا کہ سارے کام چھوڑ دو اور میرے رسول کی سیرت مکمل کرو۔''تین مرتبہ سیرت، سیرت، سیرت پھر ہاتھ اور انگلی کے اشارے کیے کہ''سب کام چھوڑ دو''اور اس کو مکمل کرو۔18 نومبر 1914 بمطابق ذوالحجہ 1332ھ کی صبح ساڑھے 5 بجے چہار شنبہ کو مالک حقیقی سے جا ملے۔شبلی کے ذوق کا چراغ اس وقت پورے طمطراق سے جل اٹھا جب سرسید کے کتب خانے میں عربی،تاریخی جغرافیائی کی نادر اور شاہکار کتابیں ان کے مطالعہ میں آئیں۔

شبلی کے کارنامے اور تصانیف

1880ء میں انہوں نے رسالہ ظل الغمام فی مسلہ القراۃ خلف الامام لکھی یہ 40 صفحات پر مشتمل تھا۔المامون کتاب لکھی جو بنو عباس کے نامور بادشاہ مامون الرشید کی زندگی اور عہد سلطنت کے حالات بیان کئے ملکی حالات کارناموں پر اخلاق وعادات پر روشنی ڈالی ہے۔سفرنامہ روم وشام مولانا جب 1892ء میں روم وشام کے سفر پر گئے اور اس سال واپس آئے وہاں کے حالات

کالجوں کے جلسوں میں بیان کئے تو رفقاؤ احباب نے ان کو کتابی شکل میں لانے کی خواہش کی۔رسائل شبلیہ مجموعہ 1857ء تک کے مولانا کے مختلف مضامین پر مشتمل ہے۔ الفاروق یہ تصنیف دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے میں حضرت عمر کے سوانح خلافت وفتوحات کی تفصیل درج ہے۔ دوسرے میں ان کے شاندار امور کا ذکر ہے جو کہ اس وقت کی تہذیب وتمدن کا آئینہ ہے۔ اس میں انہوں نے عمر فاروق کے ملک کی جوجغرافیائی تقسیم کی ہے۔ جیسے کہ امور میں عدالت، فوج داری، صنفیہ فوج، رعایا کے حقوق، سیاست وتدبر، عدل وانصاف، ذاتی معاملات وواقعات کا ذکر کیا ہے ۔رسالہ بعنوان امکات المعتدی علی نصبات المقتدی تحریر کیا۔ مسلمانوں کی گزشتہ تعلیمیہ مسلمانوں کے شاندار تعلیمی ماضی پر ہے۔ الغزالی شبلی یہ تعلیمی تصنیف حیدرآباد دکن کے قیام کے دوران لکھی گئی اور 1902ء میں مکتبہ نامی کان پور سے پہلی بار شائع ہوئی۔اس میں امام غزالی کی تعلیم کو موضوع تعلیم بنایا۔علم الکلام ’الکلام‘ ’علم الکلام‘ الکلام بھی جدید کلام کی باری آئی۔ یہ سب 1902ء تا 1903ء کے عرصہ میں ساری لکھی گئیں۔06-1904ء میں سوانح مولانا روم لکھی جس میں مولانا کی مثنوی اور دیگر تصنیفات کو موضوع بنایا گیا۔ موازنہ انیس ودبیر یہ کتاب 1907ء میں منظر عام پر آئی۔انیس سے دلی لگاؤ تھا اس لیے انیس کی طرف اُن کا جھکاؤ زیادہ تھا۔اس کو مطبع مفیدہ عام آگرہ نے شائع کیا۔1908ء میں اورنگ زیب عالمگیر کے کارناموں پر کتاب لکھی۔ شعرالعجم 1912ء میں چار جلدوں پر مشتمل کتاب لکھی۔ جلد پنجم ان کی وفات کے بعد 1918ء میں شائع ہوئی۔جس میں فارسی کے شعراء کے آغاز عباسی ومروزی سے نظامی تک کے تذکرے اور شعراء اکرام کے مطالعہ پر مشتمل ہے۔ دوسری جلد میں خواجہ فریدی الدین عطا سے لے کر حافظ ابن یمیسن تک کے تذکرے اور مطالعہ کلام ہے۔تیسری جلد میں شعراء کے متاخرین سے کلیم تک کے تذکرے شامل ہیں۔ چوتھی جلد میں شاعری کی حقیقت، فارسی شاعری کے محاسن اور مختلف اصناف مثنوی، شاہ نامہ فردوسی اور تبصرے شامل ہیں۔ مقالات شبلی یہ آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد فارسی، دوسری ادبی تیسری تعلیمی چوتھی تنقیدی پانچویں تاریخی موضوعات پر ہے۔ چھٹی تاریخی مضامین، ساتویں فلسفیانہ مضامین اور آٹھویں جلد متفرق مذہبی، علمی، تعلیمی وسیاسی مضامین پر مشتمل ہے۔کلیات اردو یہ ان کی نظموں کے مختصر مجموعے ہیں۔اس میں مثنوی، مسدس، قصائد، جدید مذہبی، اخلاقی نظمیں، سیاسی نظمیں، متفرق مرثیے شامل ہیں۔ یہ 118 صفحات پر مشتمل ہے۔ دیوان شبلی یہ

شبلی کا فارسی کی شاعری کا مجموعہ ہے۔ مکاتیب شبلی، دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ خطوط کے مجموعے پر، یہ ان خطوط پر مبنی ہے جو عطیہ فیض اور زہرا فیض کے نام پر لکھے گئے۔ باقیات شبلی یہ مقالات شبلی کی جلد ہشتم کے ان باقیات پر مشتمل ہے جو مقالات شبلی میں قابل اشاعت نہ ہو سکے۔ سیرت النبی آپ کی تخلیقی شاہکار ہے۔ یہ حضرت محمد ﷺ کی حالات زندگی کی مکمل عکاسی کرتی ہے ۔سیرت النبی ایک ایسا نادر شاہکار ہے جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ یہ بے نظیر تخلیق ہے اور رہتی دنیا تک رہے گی۔ بات مذہبی ہو یا سیاسی، تہذیبی ہو یا اخلاقی معاشرتی یا معاشی ہر میدان میں شبلی کے کارنامے نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہ وہ شخصیت ہے جس نے مذہب کو جمود سے نکال کے سدھارا اور نئی راہوں پر گامزن کیا۔شبلی کی نثر نگاری میں تخیلی قوت نے ایسا دل گداز حسن پیدا کیا ہے اور کشش دی ہے کہ شبلی کی اتبناطی منطق کی جگہ تجزے کو بنیادی اہمیت دینے والی استقرالی منطق کی جگہ تجربے کو بنیادی اہمیت دینے والی استقرالی منطق نے لے لی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی یاد آج بھی زندہ ہے اور زبان ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔

عثمان حفیظ تبسم

عشق زور آور

''ہم شادی کے بعد الگ رہیں گے نا؟''

روبی نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے عثمان جسے وہ پیار سے شانی کہہ کر پکارتی تھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اُس کے چہرے کی رونق ماند پڑ گئی اور اُس نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا:

''چلو میں تمہیں گھر ڈراپ کر دوں۔''

روبی نے بھی چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے کپ میز پر رکھا اور پرس اُٹھا کر شانی کے ساتھ ہو لی۔ دورانِ سفر دونوں مسلسل خاموش رہے۔ شانی کے رویے سے اُسے احساس ہو چکا تھا کہ یہ بات اُسے سخت ناگوار گزری ہے لیکن وہ کسی طور بھی اپنے مستقبل کے بارے کسی بھی قسم کا سمجھوتا کرنے کے حق میں نہیں تھی۔ روبی کو گھر ڈراپ کرنے کے بعد شانی گھر پہنچا تو بہت تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔ ڈور بیل بجانے کی بجائے اپنے پاس موجود چابی سے دروازہ کھول کر گھر داخل ہوا تو سامنے لان میں زاہدہ بیگم لوہے کی کرسی پر براجمان تھی۔ وہ حسبِ عادت ماں سے دعائیں لینے کی غرض سے بڑھا تو اُس کے قدم بوجھل سے بوجھل تر ہوتے چلے گئے۔ وہ ماں کے پاس پہنچا تو ماں نے فوراً سوال کر دیا:

''بیٹا کیا بات ہے آج تم کچھ ڈسٹرب لگ رہے ہو؟''

وہ کچھ کہے بنا ہی ماں کے قدموں کے پاس سبز گھاس پر بیٹھ گیا۔

''بیٹا روبی نے کچھ کہا ہے؟''

ماں نے اپنا سوال پھر سے دوہرایا۔

''ماں آپ کو شادی کر لینی چاہیے تھی۔''

شانی نے ماں کے سوال کا جواب دینے کی بجائے اپنی ہی کہی۔ زندگی تنہا نہیں گزرتی لیکن آپ نے پتہ نہیں کیسے اپنی زندگی کے تیس برس تنہا گزار دیئے۔ بیٹا میں جانتی ہوں اگر میں چاہتی تو مجھے جان سے پیارے آپ کے والد زاہد کی وفات کے بعد دوسری شادی کر کے اچھی خاصی آزدواجی زندگی میسر آسکتی تھی۔ آپ کے والد کی وفات کے بعد جب میں تمہیں لے کر میکے آئی تو میری والدہ نے بار ہا بار مجھ پر دوسری شادی کیلئے مسلسل دباؤ ڈالا لیکن مجھے اپنی سچی محبت کی آخری نشانی سے جدا ہونا ہرگز قبول نہیں تھا۔ اِس لیے میں نے دوسری شادی سے صاف انکار کر دیا۔ شانی کی قوتِ سماعت اب جواب دینے کے درپہ تھی اُسے اپنا دماغ پھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا لہٰذا وہ یہ کہتے ہوئے اُٹھا کہ:

''ماں مجھے کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دیا جائے۔''

☆....☆....☆

روبی گھر میں داخل ہوئی تو اُس کی چھوٹی بہن آشی بیڈ پہ کتابیں پھیلائے کچھ لکھ رہی تھی۔ روبی غمگین حالت میں پرس کو میز پر پٹختے ہوئے بیڈ پر لیٹ گئی۔ روبی کو اِس حالت میں دیکھ کر آشی اُس کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور سر کو اپنی گود میں رکھ کر اُس کے ریشمی بالوں کو سنوارتے ہوئے پوچھنے لگی:

''آپی کیا بات ہے آج تک میں نے آپ کو اتنا ڈسٹرب نہیں دیکھا؟''

آشی اُس نے آج مجھ سے شادی کی بات کی اور میں نے اُس پر واضح کر دیا کہ میں شادی کے بعد الگ گھر میں رہوں گی۔ جوائنٹ فیملی میں رہنا میرے لیے ممکن نہیں۔

''اوہو کیا لڑکی ہو یار تم؟''

آپی آپ اپنی اِس ناجائز خواہش کی تکمیل کی ضد میں ایک بہت اچھے انسان کو کھو دوں گی۔ آپی سمجھنے کی کوشش کریں وہ اُس ماں کو خود سے الگ کیسے کر سکے گا جس نے اپنی جوانی صرف اِس اُمید پہ گزار دی کہ اُس کا بیٹا بڑا ہوگا، اُس کی شادی کرے گی تو اُس کے دن بھی پھر آئیں گے۔ وہ بھی زندگی کی رونقیں دیکھ سکے گی۔ تم ایک ماں کے خوابوں کو چکنا چور کرنے جا رہی ہو۔ بس کر دو آشی اپنا لیکچر میں کسی صورت بھی اپنے اصولوں پر سمجھوتا نہیں کر سکتی۔ اور ہاں اگر اُسے مجھ سے محبت ہوئی تو وہ میری بات کو رد نہیں کر سکے گا۔

''واہ! کیا کہنے آپی۔''

ماں سے اُس کا واحد سہارا چھین کے تم محبت کی تکمیل چاہتی ہو۔

''آپی اگر اُسے تم سے محبت ہوئی تو وہ کسی صورت بھی آپ کی یہ ناجائز خواہش نہیں مانے گا۔''

آشی غصے سے اُٹھی اور اپنے بیڈ پر سونے کے لیے لیٹ گئی جبکہ روبی بھی سوچوں کی کھائیوں سے ہوتی ہوئی نیند کی وادی میں چلی گئی۔

☆....☆....☆

شانی کھڑکی کے پاس کھڑا دور سرد ہوا سے جھولتے درختوں کو دیکھتے دیکھتے ماضی کی ناقابلِ فراموش یادوں میں کھو جاتا ہے۔اُسے یاد پڑتا ہے کہ والد کی وفات کے بعد اُس کی ماں اُسے ننھیال لے آئی تو اُس کی نانی اُس کی ماں کو شادی کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے بہت زیادہ سمجھایا کرتی اور کہا کرتی بیٹی زندگی بہت لمبا سفر ہے کس کے سہارے کٹے گا۔ماں آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا کرتی:

''میرا شانی بیٹا ہے نا۔''

جس پر نانی امی ایک اور دلیل پیش کرتے ہوئے کہتی کہ اگر بڑا ہو کر وہ تمہیں چھوڑ گیا تو؟ اِس پر ماں ایک سرد آہ بھر کر کہتی کہ:

''انسان پیار کا بھوکا ہوتا ہے۔میں اپنے شانی کو اتنا پیار دوں گی کہ وہ مجھے چھوڑ نہیں سکے گا۔''

مگر اُس سے یہ اُمید نہیں رکھوں گی۔چند سال یہ سلسلہ چلتا رہا۔ماں ایک پرائیویٹ سکول میں جاب کر کے شانی کے نازنخرے اُٹھایا کرتی۔شانی بچپن سے لڑکپن اور اب تو جوان ہو چکا تھا۔ہوا کا ایک سرد جھونکا اُسے ماضی سے پھر حال میں لے آیا۔وہ پلٹا اور بیڈ پہ آ کر لیٹ گیا۔پھر موبائل اُٹھایا اور ٹائپ کیا میں کل دو بجے کنٹین پر تمہارا انتظار کروں گا۔اور سینڈ کا بٹن پریس کر کے موبائل تکیے کے پاس رکھ کے سونے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

☆....☆....☆

روبی بالکل خاموش اُس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔شانی خاموشی توڑتے ہوئے بولا:

''کیا لو گی روبی؟''

روبی نے شانے اُچکاتے ہوئے حسبِ عادت کہا:

''کچھ بھی ہو جائے۔''

شانی نے ویٹر کو دو چائے کا کہا اور پھر روبی سے متوجہ ہوا۔ دیکھو روبی آپ نے شادی کے لیے جو شرط رکھی ہے اُس کی تکمیل ممکن نہیں ہے۔ روبی یہ الفاظ سن کر غصے میں آئی اور بے ساختہ بولنے لگی:

''یہ مرد ہوتے ہی ایسے ہیں لڑکی کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا اور پھر ٹشو پیپر کی طرح پھینک دیا۔

شانی جواب تک روبی کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا ہاتھ جھٹکتے ہوئے غصے سے طیش میں آ کر بولا:

''روبی کوئی ایک وجہ بتا سکتی ہو جب میں نے تمہارا استعمال کیا ہو؟''

ہاں یہ سچ ہے کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے اور میں دن میں جب تک ایک بار تمہیں مل نہ لوں مجھے سکون نہیں ملتا۔

''شانی پلیز میرا مطلب یہ نہیں تھا۔''

میری بات سنو تو۔۔۔ نہیں نہیں آج تک تم کہتی رہی اور میں سنتا رہا لیکن آج میں بولوں گا اور تم صرف اور صرف سنو گی۔ وہ روبی کی بات کو کاٹتے ہوئے بولتا چلا گیا۔ میں تمہیں جتنی بار بھی ملا ہوں عوامی جگہوں پر ملا ہوں، کبھی تنہائی میں ملنے کیلئے نہیں کہا، تمہیں اپنے گھر لے کے گیا تو صرف ماں سے ملوانے کیلئے اور تم کہتی ہو میں نے تمہارا استعمال کیا ہے۔ روبی یہ نہیں کہ شیطان مجھ پر حملہ آور نہیں ہوتا تھا۔ میرے اندر بھی نفس ہے۔ شیطان مجھے بھی ناپاک عزائم کی تکمیل کے لیے اُکساتا رہا مگر میں نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا کیونکہ میں اپنی محبت کو داغ دار نہیں کر سکتا تھا اور تم کہتی ہو میں نے تمہیں استعمال کیا ہے۔ ''شانی میری بات تو۔۔۔'' اُس نے اُس کی بات سنی ہی نہیں اور مزید بولتا چلا گیا۔ یہ کیسی محبت ہے کہ تم میری اُس ماں کو قبول کرنے کو تیار نہیں جس نے اپنی ساری زندگی اِس اُمید پر گزار دی کہ میں بڑا ہو کر اُس کے زخموں پر مرہم رکھ سکوں اور تم کہتی ہو میں اُس ماں کو تمہارے لئے اپنے سے دور کر دوں۔ سوری روبی یہ ممکن نہیں۔ شانی میری بات تو سنو میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔ ''جب سننے کو کچھ رہا ہی نہیں تو سنا کیا جائے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اُٹھا۔

روبی ساکت جیسے کوئی بت ہو بیٹھی شانی کو دیکھ رہی تھی۔ اُس میں اب اُٹھنے کی سکت نہیں تھی اُسے ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے اُس کے اپنے اُوپر کوئی بھاری بھرکم پتھر رکھا ہوا ہو۔ وہ بے جان کی سی ہو کر شانی کو مسلسل دیکھے جا رہی تھی۔

''اُٹھو روبی میں تمہیں گھر ڈراپ کرتا چلوں میرے پاس وقت نہیں ہے۔''

☆....☆....☆

روبی کی زندگی میں اب اداسی کے بادل گھرے ہو گئے تھے۔ جھکے شانوں اور غمگین طبیعت سے روبی گھر آتے ہی سیدھی اپنے کمرے میں جا کر اُوندھے منہ بیڈ پر گر گئی اور ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ آشی نے پاس آ کر آہستہ سے پوچھا:

''آپی یہ اُداسی کے بادل کب چھٹ پائیں گے۔''

''آشی مجھے کچھ دیر تنہا رہنے دو پلیز۔''

''اچھا میں آپ کیلئے چائے لاتی ہوں۔''

یہ کہتے ہوئے وہ اٹھی اور چائے بنانے چلی گئی۔ چائے کے دو کپ ٹرے میں رکھے آشی کمرے میں داخل ہوئی اور ایک کپ روبی کی طرف بڑھاتے ہوئے برابر میں بیٹھ گئی۔ چائے کا ایک گھونٹ لیتے ہی جیسے چلا اٹھی۔ بے وقوف کہیں کی، گھر میں چینی نہیں ہے کیا؟ تمہیں پتہ بھی ہے کہ مجھے پھیکی چائے پسند نہیں۔ آشی نے ایک چمچ چینی کپ میں ڈال کر حل کرتے ہوئے کہا۔ آپی جس طرح چینی نہ ڈالنے کی وجہ سے چائے بدمزہ تھی بالکل اِسی طرح شانی کے بغیر تمہاری زندگی ادھوری ہے۔ اور ہاں جس طرح ایک چمچ چینی ڈالنے سے بدمزہ چائے لذیذ بن گئی ہے اِسی طرح تمہارا ضد چھوڑ کر معذرت کر لینا تمہاری نامکمل زندگی کو مکمل کر سکتا ہے۔ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کیجئے۔ پلیز!

روبی چائے ختم کر کے خاموشی سے بیڈ پر کروٹ لیے دیر تک سوچتی رہی اور پھر تکیے کے پاس پڑے موبائل کو اُٹھا کر ٹائپ کرنے لگی۔

''شانی میں بہت احمق، بہت بری۔ بہت خود غرض سہی جو تمہاری محبت کو سمجھ نہ سکی۔ تمہارے دور چلے جانے سے مجھے احساس ہوا کہ میں تمہارے بغیر ادھوری ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ میری غلطی بہت بڑی ہے لیکن اِس اُمید سے معافی کی طلب گار ہوں کہ

آپ مجھے معاف کر دیں گے۔ میں تمہارے لیے اپنی ہر ضد، ہر خواہش کو پسِ پشت ڈال دوں گی۔ پلیز شانی مجھے مکمل کر دو؟''

روبی نے سینڈ کا بٹن پریس کیا تو اُسے اپنے اُوپر سے وہ بھاری پتھر ہٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اُس نے موبائل سائیڈ پر رکھا اور بے چینی میں بار بار بیڈ پر کروٹیں لینے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد موبائل کی سکرین روشن ہوئی تو روبی فوراً موبائل کی طرف لپکی تو دیکھا کہ ٹیکسٹ شانی کا ہی تھا۔ اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ ٹیکسٹ اوپن کیا تو لکھا تھا

''روبی! آؤ مل کر پھر سے نئی زندگی جی لیں۔''

قلم قرطاس ادبی مجلس کا خصوصی اجلاس شعبۂ اُردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی میں منعقد ہوا جس میں نئی انتظامیہ کا انتخاب کیا گیا۔ صدر شعبۂ اُردو آصف اعوان صاحب نے طلبہ کے نام اپنے پیغام میں کہا کہ یہ تمام منتظمین نہ صرف اپنی کلاسوں میں ایک خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس موقع پر ڈاکٹر آصف اعوان، ڈاکٹر محمد ارشد اویسی، ڈاکٹر طارق ہاشمی، ڈاکٹر اصغر علی بلوچ اور اس کے ساتھ ہی طلبا کی کثیر تعداد نے بھی شرکت کی۔

عہدیداران میں:

مدیرِ اعلیٰ:	عثمان حفیظ
مدیر:	حافظ عامر شہزاد
نائب مدیران:	ساجد رضا، مائرہ منظور
ناظم مالیات:	اعجاز احمد، فرزانہ کوثر

منجانب:

قلم قرطاس ادبی مجلس

شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی فیصل آباد

محمد مزمل صدیقی

یادِ ایام

اُستاد صاحب

انٹرمیڈیٹ ایف۔ایس۔سی شعبہ اُردو، سہیل اصغر صاحب میرے اُستاد تھے...خدائے عظیم اُن کی زندگی رکھے...میری اُن سے کبھی نہ بن پائی تھی...اعلیٰ ثانوی سال اوّل سے لے کر ثانوی سال دوم تک۔اُس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے کبھی اُن سے باقاعدہ رفاقت نہ نبھائی تھی...وہ جب بھی کلاس کے اگلے حصے سے وارد ہوتے...میں پچھلے دروازے سے چھپتا چھپاتا نکل جاتا...اور جب معلوم پڑتا کہ وہ چلے گئے تو میں پھر پھرا کر واپس آجاتا...مزید مجھے کچھ دلچسپی اُن سے اِس لئے نہ تھی کہ وہ میرے نثر پاروں کی بابت اکثر کہا کرتے تھے کہ:

''خدا کبھی کسی کو صدیقی کی تحریر نہ پڑھوائے...''

یا یہ کہ بھری تحریر میں کوئی فقرہ بے ربط نظر آیا تو کہہ دیتے:

''یہ بھی کوئی ربط ہے...میں یہاں تھا اور وہ ڈِنگے نالے پر تھا۔''

ساتھیو! نالہ ڈِنگہ ہو یا سیدھا...ویسے یہ اُن کا طرح دار حسد تھا...جو وہ کسی بیمار جملے کو تاڑ کر نکالتے تھے۔

اول الذکر مجھے بعینہٖ ایسے لگتا جیسے بیگم اختر ریاض الدین نے کسی موقع پر کہا تھا کہ:

''خدا کسی شریف آدمی کو کلکتہ نہ لے جائے...''

ایسے ماحول میں میری اُن سے بگڑ گئی...اب ایسے اچھے بھلے اُستادوں کو کون کیا کہے۔

''تحریر لکھی ہے تو بھئی آپ کا شاگرد ہوں...حق بنتا ہے تعریف و توصیف سے نہ سہی تحریر میں موجود جملوں اور کرداروں سے اختلاف کر کے میرے نظریات و خیالات کو درست راستے پر گامزن کریں۔''

ایک مرتبہ کے مسودے کی سپردگی اور کھڑتل جواب کے بعد میرا اُن سے قطع تعلق ہو گیا... کبھی سنجیدگی سے پیریڈ نہ لئے... اگر لئے تو سر جھکائے بیٹھا رہا اور اُن کے علم پر کبھی توجہ نہ کی... یہاں تک کہ ضد میں کتاب بھی نہ کھولی... ہاں وہ موجود نہ ہوئے تو کتاب کھول لی... کچھ اِس واسطے کہ کسی دن یہ موصوف نہ ہوں تو انتظامیہ نے سیڑھیاں چڑھا کر مجھ سے اُردو کا پرچہ لینا ہے۔

☆....☆....☆

مَیں نے دوسرے سال متعدد اُردو کے پرچے دیئے... مگر اُستاد صاحب نے کبھی مجھے ایک سو میں سے '۳۵' کی سرحد عبور نہ کرنے دی... ایک روز میں نے طوعاً وکرہاً تحمل کی سرحد تعمیر کر لی مگر ایک روز وہ بھی ٹوٹ چلی... مَیں نے تاؤ کھا کر یہ بات انتظامیہ تک پہنچائی کہ:

''اُستاد صاحب اب اَنا پر قابض ہو چکے ہیں اور مجھے کسی طَور خاطر میں نہیں لاتے... اگر مَیں غلط ہوں تو وہ میرے اُستاد ہیں... میری کسی طور راہنمائی فرمائیں... مگر مستقبل کے حوالہ سے کھیلنے کی ہرگز کوشش نہ کریں۔''

☆....☆....☆

شاہ صاحب اُن دِنوں مجھے بے حد عزیز رکھتے تھے... سخن فہم و سخن شناس تھے... حد درجہ میری تحریروں پر دل بڑھا کر داد دیتے اور انعام و کرام سے نوازتے تھے... انگریزی پڑھاتے تھے... کلاس میں میری عدم موجودگی اور آخری قطار میں بیٹھے کاہلوں میں میری شمولیت کا سختی سے نوٹس لیتے اور قطارِ اول میں فطینوں کے ساتھ بیٹھاتے تھے۔ اُنہوں نے مجھے یہ کہہ کر خاموش کروا دیا کہ:

''آپ کا یہ مقام نہیں... سو پڑھتے رہو اور لکھتے رہو... موصوف اُستاد کچھ اختلاف کریں... آپ اپنا پہلو بچاتے رہو۔''

مجھے بھلا کیا عذر ہونا چاہئے تھا... ہاں اُس روز مَیں نے یہ طے ضرور کر لیا تھا کہ کبھی اُردو کا پرچہ نہ دوں گا... اگر سالانہ پرچے میں ناکام ہوا تو اُس کے ذمہ دار موصوف اُستاد ہی ہوں گے۔

☆....☆....☆

ایک روز ہمیں بتایا گیا کہ:

''آج اُردو کا سالانہ اور آخری پرچہ ہے... پھر حکومت کے زیرِ اہتمام ہونے والے امتحانات دلوا کر یہاں سے فارغ التحصیل کر دیا جائے گا۔''

مَیں نے پرچے سے مفر کی بجائے آخری بار طالع آزمانے کا فیصلہ کرلیا تھا اور جی سے صلح کر کے سوچ لیا تھا کہ:

''کچھ ہو یہ پرچہ پھر عمدگی سے سرانجام دوں گا...اُستاد صاحب کا دِل جیتوں گا...گو پہلے کبھی ہزار کوشش کہ نہ جیت سکا تھا۔''

پرچہ اُردو کا ہو یا 'کیمیا' کا...نام کے معاملے میں میرا اُصول تھا کہ 'پرچے' کی پیشانی پر مبہم حروفِ اردو میں 'صدیقی' لکھ دیا کرتا تھا...احمد علی ثمر صاحب بڑی ڈانٹ پلاتے تھے...

'کیمیا' پڑھایا کرتے تھے...'کیمیا' کے پرچے میں میرا نام پڑھتے ہوئے الجھ جاتے تھے۔مثال کے طور پر وہ میرے پرچے کو سمجھتے تھے کہ:

''یہ ایک ایسے ناکام امیدوار کا پرچہ ہے جس کے نام کا کوئی بھی بچہ کلاس میں موجود نہیں۔''

مگر میں پکڑ لیا جاتا تھا...سبھی امیدوار جب نامہِ اعمال لئے بیٹھے ہوتے اور بغیر نامے والے کھڑے ہوتے...اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں الغرض میں نے پرچے کو خوب بیل بوٹوں سے سجایا...اچھی روشنائی اور مطلوبہ علم کو بڑے چوڑے لفظوں میں جوابی کاپی پر اتارا...وقت کی قید میں رہ کر حل کیا اور نگران کے حوالے کر کے باہر نکل آیا۔

خیالوں میں خود کو خوش کرلیا کہ دیکھنا 'اُستاد صاحب...اب حیرت سے کھل بیٹھیں گے کہ 'صدیقی' کیسے اچھے، اچھوں سے آگے نکل گیا'۔

نہ ہوئی گر مرے پرچوں سے تسلی نہ سہی
امتحان اور بھی باقی ہیں، تو یہ بھی نہ سہی

عزیزو! پرچہ معیار پر اُترے یا نہیں...اچھی سوچ اور روشن امید رکھنے میں کون سے پیسوں کا زیاں ہے۔

☆....☆....☆

سورج کی گیند تین دن پلٹتی رہی اپریل کا موسم ہلکا سرد گرم تھا لیکن چوتھے دِن ناکامی کا پیغام لے کر طلوع ہوا:

''سنئیے! '۱۰۰' میں سے '۲۹' نمبر لے کر ٹاپ کرلیا ہے...ناکامی میں بھی پوری کلاس ٹاپ

کر لی ہے موصوف صاحب نے مجھے پھر فیل کر دیا۔''

ادارے سے شکایت میں کوئی مفاد مضمر نہ تھا... ہاں جو بڑھاس تھی وہ اُردو کے کاشف صاحب کو دِکھا کر اور اُن سے حوصلہ طلب داد پا کر پوری کر لی' طے کر لیا تھا کہ:

''ان موصوف کو کبھی سلام بھی نہیں کروں گا جنہوں نے مجھے اُردو میں بھی فیل کر دیا...

حیرت ہے ایک ہی تو مضمون تھا جو ذِلت سے بچائے رکھتا تھا...''

اِس ردِعمل کے بعد مَیں ایک ہفتہ تک اکیڈمی نہ گیا...نہ دیگر پرچے دیئے...اگلے چند روز میں سالانہ امتحانات شروع ہو گئے...مجھے آج بھی وہ روزِ روشن کی تصویر نظر آتی ہے جب اُردو کا پرچہ تھا اور اُس سے ایک رات پیشتر میں جلد جلد 'سرمایہ اُردو' کے اوراق اُلٹ رہا تھا۔ موصوف اُستاد نگرانی پر فائز مجھے کینہ توز نگاہوں سے گھور رہے تھے...مَیں سر جھکائے، حقارت سامنہ لیے، کنکھیوں سے اُن کے ردِعمل کا جائزہ لے رہا تھا...ایک بار جب آنکھیں چار ہوئیں تو برہم ہو کر فرمانے لگے:

''جو کچھ تم یہاں لکھتے ہو نا...وہاں ویسے نہ لکھنا...مَیں تو تمہیں پاس کر دیتا ہوں...حکومت تجھ جیسے کاہلوں کو کبھی پاس نہ کرے گی۔''

مجھے بات کرنے کا حوصلہ مِل گیا...کھڑے ہو کر مَیں نے سانس اور آس بھرے ساز میں ڈوب کر کہا:

''سر! پورے دو سال آپ مجھ سے ناانصافی برتتے آئے ہیں...آخرِ شب بھی بجھی امید مجھ میں پیوست کر رہے ہیں' آخری موقع جبکہ صبح پرچہ ہے' ایسے الفاظ تو نہ کہئے گو بھلے سے فیل ہو جاؤں۔''

اُس ہیجان انگیز ثانئے میں جب جماعت اُن چاروں آنکھوں کا اُچک اُچک کر جائزہ لے رہی تھی لیکن اُن کی آنکھیں میرے جھریوں اور تِلوں بھرے چہرے پر بھول پَن کا چھینٹا تلاش کر چلی تھیں...تبسم فرمایا اور جذب میں تڑپ کر بولے:

''جا...صدیقی! میں نے کبھی تمہارے ساتھ اِنصاف نہیں کیا...آج تمہارے ساتھ اِنصاف کر رہا ہوں، اِس سال اُردو میں تم ٹاپ کرو گے۔''

حیرت کا ایک مجسمہ یہ سنتے ہی میرے وجود میں داخل ہو گیا۔

''سر! یہ... یہ! آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟''

''ہاں میں پورے دو سال تمہیں اِس لیے فیل کرتا رہا ہوں کہ تُم بار بار پڑھو اور سکالر بنو...''

میں نے زِیرلب دہرایا:

''سکالر!...''

انہوں نے متانت سے سر ہلایا اور بولے:

''ہاں سکالر...''

''مگر اُس میں میرے نثر پاروں کا کیا دوش؟''

مسکرائے اور فرمایا:

''وہ اِس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایامِ طفل میں عظیم صلاحیتوں سے نوازا ہے... میں تمہاری صلاحیتوں کا معترض نہیں ہوں... میں تمہاری حوصلہ شکنی اِس لئے کرتا رہا ہوں کہ خود کو مکمل جان کر کہیں تکبر تمہارے اندر جنم نہ لے۔''

☆....☆....☆

تکبر کا مجھ سے خُدا واسطے کا بیر تھا یوں نہیں کہ اِدھر میرے کسی مضمون، کہانی نے قارئین کی نظر حاصل کر لی اور میں نے اپنی دَسوں اُنگلیاں دَسوں چراغ کر لیں...کِسی کو خاطر میں نہ لایا، بلکہ قلم پکڑتے ہی میں ہمیشہ حوصلہ افزائی کا متمنی رہا... نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ۔ میں بے اختیار اُن کے قدموں میں جُھک گیا...اُنہوں نے سینے سے لگایا اور فرمایا:

''کرنے کا کام یہ ہے کہ پہلے پہل اپنی تعلیم مکمل کرو اور ساتھ میں عالمی اَدب پر بھی نظر رکھو تا کہ تمہارا شمار اُن جوہرِ قابل قلمکاروں میں ہو... جو قوم کے دِلوں میں آج بھی زندہ ہیں اور وہ انہیں فخر سے نا صرف پڑھتی ہے بلکہ انہیں یاد بھی رکھتی ہے۔''

☆....☆....☆

اُس لمحے مجھ پر جذب کی کیفیت طاری تھی...اُنہوں نے کلاس کے 'سی۔آر' کو بلوایا اور میرے سالانہ نمبر خفیہ طور پر نتائج سے پیشتر کاغذ پر لکھوائے۔

پھر با آواز بلند کہا:

’’صدیقی! اِن نمبروں سے بڑھ تو سکتے ہو... گھٹ کسی طور نہیں سکتے۔‘‘

’’یہ!... یہ! آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟‘‘

’’باتوں کا وقت نہیں، شاباش پڑھتے رہو۔‘‘

اُس گھڑی میرے دِل وجود میں اُن کے لئے ایسا احترام طاری تھا جو مرغِ بسمل کی طرح تڑپ بھی رہا تھا اور خوشی کے ساتھ مل کر رقص بھی کر رہا تھا۔

☆....☆....☆

رات اطمینان سے پڑھتے گزری، سویرے شفق طلوع ہوا، پرچے کا وقت ہوا، تسلی سے حل کیا اور دوبارہ اکیڈمی پہنچ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ موصوف بچوں کو گھیرے پرچے کا جائزہ لے رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی تاثرات انہوں نے دور سے آنک لیے چلائے:

’’ہاں... صدیقی!‘‘

’’کر آیا ہوں... آگے خُدا بہتر جانتا ہے... کیا ہوگا... کچھ معلوم نہیں...‘‘

انہوں نے پرچہ ’الف‘ اور ’ب‘ کے نمبروں کا تخمینہ لگایا تو اَب کے ’۵۰‘ سے آگے بڑھنے کی امید نہ رکھ سکے۔ میں چڑھتے سورج کے ساتھ پھر قعرِ مایوسی میں ڈوب گیا۔

☆....☆....☆

وقت بیت گیا... رات ڈھل گئی... صبح طلوع ہوئی... پھر کئی شامیں اور صبحیں تمام ہوئیں... جب نتیجہ آیا تو اردو میں ۱۰۰ میں سے ۷۵ کا ہندسہ جڑا جگمگا رہا تھا... میں خوشی میں سرشار دَوڑا دَوڑا اُستاد جی کے یہاں پہنچا کہ:

’’اُن کے نظریات کی نفی کروں کہ میں جو کچھ اُن کے پرچے میں لکھتا رہا تھا... وہ مجھے واقعی جان بوجھ کر فیل کرتے رہے... ورنہ میں جو لکھتا تھا... ایک دَم ٹھیک لکھتا تھا... اُس پرچے کا جائزہ لیتے ہوئے ممتحن بھی یقیناً دنگ رہ گیا ہوگا...‘‘

☆....☆....☆

دروازے پر پہنچا... وہیں اُن کے والدِ محترم غلام اصغر مل گئے... انہوں نے نتائج کی بابت دریافت کیا... بہترے خوش ہوئے... گلے لگایا... پھر مٹھائی کا تقاضا کیا... مَیں نے اگلے دِن پر موقوف کیا... موصوف کی بابت دریافت کیا:

''اُستاد صاحب کہاں ہیں؟''

''اندر ہیں...وضو کر رہے ہیں...آتے ہیں۔''

اُس روز جمعتہ المبارک تھا...وہ عجلت میں گزر گئے...مَیں اصغر صاحب سے مفارقت سے تنہا کھڑا تھا...میں نے دیکھا کہ موصوف صاحب تولیے سے منہ پونچھتے تیز تیز چلے آ رہے ہیں...

ہائے وہ اُن کا فربہ اور دراز قد...میں دھند لپٹ گیا اور کہا:

''سر! آپ نے پرچے سے ایک رات بیشتر مجھے دعا دی تھی نا؟''

''کونسی دُعا...''

اُن کے چہرے پر حیرت کی قلعی کھل گئی۔

''یہی کہ تم ٹاپ کرو گے...''

''ہاں تو پھر...''

اُس لمحے ہونقوں کی سی کیفیت اُن پر طاری تھی اور میں سوچ رہا تھا خود پر طاری خوشی کا سحر اُن پر کیسے ظاہر کروں...بہ مشکل میں بول پایا۔

''میں آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ فطینوں میں آپ کے حسن رضا نے '۷۸' جبکہ کاہلوں میں آپ کے 'صدیقی' نے '۷۵' نمبر لے کر ٹاپ کر لیا ہے...''

اُس گھڑی اُنہوں نے محسوس کیا کہ 'صدیقی' یقیناً جھوٹ بول رہا ہے۔

''رزلٹ کارڈ کہاں ہے؟''

''یہ رہا...''

وہ نمبر دیکھتے رہے اور ورطہ حیرت میں آسمان کو تکتے دم بخود کھڑے رہے۔مَیں نے پھر جھنجھوڑ کر کہا:

''سر! جی اللہ نے آپ کی زبان مبارک کر دی ہے...اور میں نے '۷۵' نمبر لیکر ٹاپ کر لیا ہے۔''

''ہاں...'۷۵' سالِ دوم سے اور '۶۶' سالِ اول سے ... یار گزشتہ سال بھی تھوڑی محنت کر لیتے تو '۱۵۰' کا ہندسہ پار کر لیتے...''

غرض اُس لمحے اُستاد صاحب اپنے پریشان اور تر بالوں کے ہمراہ میری معصومیت، میرے طرزِ عمل اور میرے نتائج کو دیکھ کر باغ باغ ہوئے...اور میری کامیابی پر اتنے شاد ہوئے، کہ میرا جی چاہ رہا تھا اُن کا جی خوش کرنے کے بعد اپنے اللہ جی کو بھی مٹھائی بھیج دوں۔

''تھل میں ٹھنڈی چھاؤں سے ماخوذ''

مطبوعہ: روزنامہ 'اوصاف' سنڈے میگزین

(نومبر ۲۰۱۴)

دانش حسین

بھوک

فون کان سے لگائے وہ پتہ نہیں کتنی دیر ساکت کھڑا رہا تھا۔

ایک راستہ۔۔۔

ایک راستہ۔۔۔

کانوں میں مسلسل ایک ہی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

4سال۔۔۔

پورے چار سال وہ اپنی کُل متاع MS کی ڈگری اور ''ایمانداری'' پر مشتمل تھی۔۔۔لے کر خوار ہوا تھا!

وہ ہمت ہارنے والوں میں سے نہ تھا مگر پھر بھی کبھی کبھی خود کو بے بسی کی انتہا پر کھڑا محسوس کرتا۔۔۔

خود کو ٹوٹ کر بکھرتا محسوس کرتا۔۔۔

یہ ٹوٹ پھوٹ کا عمل اندرونی ہی ہوا کرتا۔۔۔چہرہ کبھی اندرونی جذبات کی عکاسی نہیں کرتا تھا۔۔۔

یہ ایک شعوری عمل تھا کہ وہ اندر کے درد کی جھلک چہرے پر نہ آنے دیتا کہ۔۔۔شاید اسی وجہ سے اس کی دمے کی مریض بوڑھی ماں نے حالات کی تنگدستی کا ادراک رکھتے ہوئے بھی بیٹے کے چہرے پر کبھی کوئی سایہ لہرانے نہیں دیکھا تھا۔۔۔

اور یہی بات تو اُسے ہمت دیتی۔۔۔بیٹے کے مضبوط تنے ہوئے اعصاب والا چہرہ اُسے مجبور کرتا کہ آگے بڑھ کر اکیلے پورے جہان سے لڑتے بیٹے کو دعائیں دے اور اُسے سب اچھا ہو جانے کی اُمید دلائے۔۔۔گو کہ اسے اپنے الفاظ بہت کھوکھلے محسوس ہوتے۔۔۔

لیکن اب وہ ٹوٹتا جا رہا تھا۔۔۔ چہرہ اب اندر کی ٹوٹ پھوٹ کی چغلی کھانے لگا تھا۔۔۔
یہ بھوت بس پہلے ایک دو سال ہی سوار رہا تھا۔۔۔ کہ ''صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔''
کچھ عرصے بعد اُس پر حقیقت کھلتی گئی کہ کم از کم جس ملک کا وہ باشندہ ہے وہاں صبر کے پھل کے طور پر مزید ''صبر'' ہی ملتا ہے!!!
لیکن پھر بھی وہ ''ایمانداری'' کا عجیب وغریب فلسفہ لیے بے''ایمانوں'' کے شہر میں گھومتا رہا۔
وہ کتنی ہی جگہوں پر درخواست دے چکا تھا۔۔۔ شاید اُسے خود بھی ٹھیک سے یاد نہ ہو!
ہر جگہ سے ہی ٹرخا دیا جاتا کیوں۔۔۔؟؟؟
اُس کے پاس کسی بڑے بزنس مین، بیوروکریٹ، وزیر یا گورنر کی سفارش نہیں تھی!!!
4 سال۔۔۔ کوئی مذاق نہیں تھا۔۔۔ اُس کی زندگی کے چار قیمتی سال قسمت کی لکھی پیشیاں بھگتے گزر گئے۔۔۔
مگر آج ایک فون کال نے جیسے بے جان وجود میں توانائی پھر دی تھی۔۔۔
4 سالوں سے فارغ پڑا دماغ جیسے ''زنگ'' لگ چکا تھا۔۔۔ اب بڑی چابکدستی سے کام کر رہا تھا۔۔۔
وہ معمول کی رفتار سے چلتا ہوا گھر داخل ہوا۔۔۔ سامنے چارپائی پر پڑا باپ دروازے کو گھور رہا تھا۔۔۔
اُسے اپنے نشئی باپ کی نظریں اپنے چہرے پر محسوس ہوئیں۔۔۔
ملتجی نظریں۔۔۔
وہ جانتا تھا۔۔۔ اُسے کیا چاہیے!
وہ خاموشی سے چارپائی کے پاس سے گزر گیا۔۔۔
وہ ابھی برآمدے کے ایک کونے میں بوسیدہ سے تخت پوش پر گٹھری کی مانند پڑی ماں تک پہنچنے ہی پایا تھا کہ زوردار آواز سے کوئی چیز زمین پر پٹخی گئی۔ اُسے معلوم تھا کہ کیا ہوا۔۔۔ اب باپ کی آواز سارے صحن میں گونج رہی تھی۔
''حرام زادہ! ماں کی پٹی کے ساتھ لگ کر بیٹھا رہ۔۔۔ اُسی کے پاس جمع کرواتا رہ

خزانے۔۔۔سؤر کی اولاد۔۔۔ باپ پر ایک ٹکہ لگانے کا راضی نہیں۔۔۔اور یہ بڑھیا جو بیماری کا ڈھونگ رچا کر تجھ سے پیسے بٹورتی ہے۔۔۔ بدچلن بڑھیا۔۔۔ ساری جوانی بھی اس کی انہی دھندوں میں کٹ گئی۔۔۔''

سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔۔۔ ماں کی بے چین نظریں اُس نے بہت شدت سے محسوس کیں۔۔۔ بڑھاپے میں بھی جب ہر جذبہ اپنی قدرتی موت مرجاتا ہے۔۔۔ وہ ماں کے چہرے پر خوف کے آثار دیکھتا۔۔۔

اولاد کے سامنے اتنی ہتک۔۔۔ وہ ماں کے زرد چہرے پر موت ناچتی صاف محسوس کرتا۔۔۔اور پھر ماں کی ملتجی نظروں کے جواب میں ہاتھ بڑھا کر جیب میں ہاتھ ڈالتا۔۔۔آج بھی اس نے ایسے ہی کیا۔۔۔

یہ آخری تیس روپے تھے جو اُس نے باپ کو چپ کروانے کے لیے ''رشوت'' کے طور پر دیئے۔

باپ پیسے ملنے پر ہر چیز بھلائے باہر چلا گیا اور وہ ماں کے پائینتی کی طرف بیٹھ گیا۔۔۔ ماں اب مطمئن تھی۔۔۔

ماں نے آج چھوٹی صغرا کو آواز نہیں لگائی تھی۔۔۔ کیونکہ آج سارا گھر فاقے سے تھا۔۔۔

''بھائی پانی!'' تیسرے نمبر کی زینت جو پانچویں جماعت کے بعد سکول سے اٹھوالی گئی تھی۔۔۔زرد سہی، نحیف وجود پر بدرنگ اوڑھنی اوڑھے پانی کا گندا سا گلاس اٹھائے جس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں، سامنے کھڑی تھی۔

وہ جانے کس جہاں میں کھو گیا۔۔۔ کبریٰ، صغریٰ، زینت، زینب، چار بھاری بوجھ۔۔۔! باپ سے شدید نفرت کے باوجود اُسے باپ پر رشک سا محسوس ہوا۔۔۔ نشے میں اطمینان تلاش کر کے وہ کتنا مطمئن تھا۔۔۔ ہر ذمہ داری سے بری الذمہ۔۔۔

ماں کی کھانسی سے وہ چونکا تھا۔۔۔

''زینت! ماں کی دوائی؟؟؟''

وہ کھوئے کھوئے لہجے میں گویا ہوا۔

''ختم ہوگئی۔'' زینت نے اسے کہا جیسے دوائی کے ختم ہونے میں سارا قصور اُسی کا ہو۔

''اوہ! سلمان کو بلاؤ۔۔۔'' اُس کا ہاتھ جیب کی طرف بڑھا۔۔۔اندر گیا اور پھر وہیں رُک گیا۔۔۔''جی بھائی؟'' سلمان کھڑا پوچھ رہا تھا اور وہ مسلسل سلمان کو گھورے جا رہا تھا۔۔۔

''ہائے۔۔۔ ہمت جواب دے گئی ہے میری۔۔۔ بچہ! بڑا لمبا دورانیہ ہے آزمائش کا۔۔۔ہائے۔۔۔بچہ! ہمت نہیں رہی اب۔۔۔بوجھ ہمت سے بڑھ گیا ہے!''

یہ ماں کیا کہہ رہی تھی؟؟؟ ماں ہار گئی تھی؟؟؟

ہار تو وہ بھی گیا تھا۔۔۔اب؟؟؟ فیصلہ ہو گیا تھا۔۔۔لمحہ لگا تھا!

وہ اٹھا۔۔۔جیب سے موبائل نکالا۔۔۔ایک نمبر ملایا اور گھر سے باہر نکل گیا۔۔۔

شام چار بجے کے قریب گھر کا دروازہ بجا۔۔۔سلمان نے دروازہ کھولا۔کوئی عجیب الخلقت انسان ہاتھ میں ایک بند لفافہ پکڑا کر رفوچکر ہو گیا۔باپ نے سلمان کے ہاتھ سے بند لفافہ اچک کر پھاڑ ڈالا۔۔۔

باپ کی رال ٹپکنے لگی۔۔۔سارا گھر اُمڈ آیا۔۔۔سوائے کونے میں پڑی ماں کے۔۔۔

چار لاکھ روپے۔۔۔!

ایک ساتھ۔۔۔ بہت سے مسائل کا حل تھے۔۔۔ ماں کو بھی کچھ سکون ملا۔۔۔مگر یہ پیسے آئے کہاں سے؟؟؟ ماں نے بارہا استفسار کیا مگر نشئی شوہر نے ہر دفع ''حرافہ'' کہہ کر جھڑک دیا۔۔۔

۔۔۔کچھ دیر گزری۔

''سلمان ذرا پتہ کرو محمود کہاں ہے۔۔۔اچانک باہر نکل گیا۔۔۔ہو سکتا ہے اُسے کچھ پتہ ہو۔۔۔سلمان میرے بچے پتہ کر میرا دل ڈوبتا جا رہا ہے۔''

تاریکی بڑھی گئی۔۔۔سورج سنہری چادر اُفق کے چہرے سے سمیٹتا گیا۔کاتب تقدیر گہری سوچتی نگاہ سے ہر چیز کا جائزہ لیتا رہا۔۔۔

''بھوک'' جیت گئی تھی اور ''انسان'' ہار گیا تھا۔۔۔

اس سے پہلے کہ تاریکی شہر کو اپنے دامن میں سمیٹتی گنجان آباد علاقے میں خودکش دھماکے کی خبر ہر طرف پھیل چکی تھی!!!

الوینا حیدر

ادھورا خواب

ثمن نے یونیورسٹی سے واپس گھر آتے ہی شور مچا دیا کیونکہ آج وہ بہت خوش تھی۔ اسے رات کو آمنہ کے گھر اُس کی سالگرہ پر جانا تھا۔ ''حلیمہ میرا بلیک فراک پریس کروا دینا''، ثمن گھر کی ملازمہ پر چلائی۔ آج وہ خوشی کے مارے پھولے نہیں سما رہی تھی۔

ثمن کا تعلق ایک ایلیٹ کلاس خاندان سے تھا۔ اس کے والد کا اپنا ذاتی کاروبار ہے۔ ثمن والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔ اکلوتی ہونے کے ناطے والدین اس کی ہر خواہش کو پورا کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نہایت مغرور سی ہوگئی اور بڑوں کا ادب واحترام کرنا بھول چکی تھی۔ اکثر اوقات وہ اپنے گھر کے ملازموں کو چھوٹی چھوٹی باتوں پر طنز کا نشانہ بناتی اور اس کی ماں اسے اُف تک نہ کہتی جس سے شاید اُس کی اور بھی حوصلہ افزائی ہوتی اور اُسے ذرا بھی اپنے اس رویے کا احساس نہ ہوتا۔

ثمن بلیک فراک میں خوبصورت لگ رہی تھی اس نے آمنہ کے لیے بھی تحفہ منگوا رکھا تھا۔ بلیک فراک میں ثمن بالکل پری لگ رہی تھی۔ اس نے ڈرائیور سے گاڑی نکالے کو کہا۔ گاڑی میں بیٹھ کر ثمن آمنہ کی سالگرہ میں شرکت کے لیے گھر سے نکلی۔

جیسے ہی ثمن پارٹی ہال میں پہنچی تو ہر کوئی ثمن کی طرف متوجہ ہوا اس وقت وہ سب سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ ہر کوئی اس پر فدا ہوئے جا رہا تھا اور اس سے دوستی کرنے کا خواہش مند تھا۔ ثمن چونکہ مغرور سی لڑکی تھی اسی لیے وہ ہر کسی سے بات کرنا پسند نہیں کرتی۔

حارث رنگین مزاج لڑکا ہے۔ ثمن اور حارث کلاس فیلو تھے۔ حارث بھی ایک خوشحال خاندان سے تھا۔ ثمن اور حارث یونیورسٹی میں بھی گہرے دوست تھے اور شاید وہ دل ہی دل میں ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے لیکن کبھی بھی دل کی بات زباں پر نہیں لا سکے۔ ثمن کو دیکھتے ہی حارث اُس کی طرف تیز قدموں سے بڑھتا ہوا آیا۔

''واہ Beautiful! تم آج بہت پیاری لگ رہی ہو۔''

یہ سنتے ہی ثمن نے محسوس کیا جیسے وہ ساتویں آسمان پر پہنچ گئی ہو اس کے رخسار گلاب کی پتیوں کی طرح سرخ ہو گئے۔

''آؤ ہم وہاں بیٹھتے ہیں۔''

حارث نے ثمن کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا اور دونوں پارٹی سے بے نیاز ہال کے ایک طرف بیٹھے باتیں کرتے رہے پھر سالگرہ کا کیک آ گیا اور سب دوست گول میز کے گرد جمع ہوئے اور کیک کاٹنے کی رسم ادا کرنے لگے یوں رات دیر تک سب دوست مل کر خوب لطف اندوز ہوتے رہے۔ رات 12 بجے کے قریب پارٹی ختم ہوئی اور سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے لگے۔ حارث بھی ثمن کو گاڑی تک چھوڑنے آیا۔ گاڑی تک آتے آتے انہوں نے کافی باتیں کیں۔ ثمن جب گاڑی میں بیٹھنے لگی تو حارث نے اُس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا:

''مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔''

ثمن: جی کہو۔ ابھی بھی کچھ کہنے والا باقی ہے۔

حارث: میں تمہیں بہت پسند کرتا ہوں اور تمہیں اپنانا چاہتا ہوں۔

یہ سنتے ہی ثمن کے دل میں ہلچل سی مچ گئی۔ شاید ثمن بھی یہ بات سننے کی منتظر تھی۔

''ہاں ہاں۔۔۔ میں بھی۔۔۔''

ثمن کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

آج کی سالگرہ پارٹی نے جیسے ان کی زندگی میں رنگ ڈال دیے ہوں۔ اب وہ روز یونیورسٹی میں بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کرتے گھر آتے ہی کبھی فون کبھی میسج رات کو بھی فیس بک اور Skype کے ذریعے دیر تک باتیں ہوتی اور اپنے مستقبل کے بارے میں سہانے خواب دیکھتے آخر کار ایک دن انہوں نے فیصلہ کیا کہ اپنے والدین سے اپنی اس محبت کا ذکر کریں اور دوستی کو ایک نام دیں چونکہ ثمن اکلوتی ہونے کی وجہ سے لاڈلی تھی۔ اس لیے اس کے والدین اسے منع نہ کر پائے اور اس شرط کے ساتھ ہاں کر دی کہ اگر حارث تم سے شادی کرنے کا خواہش مند ہے تو اپنے والدین کو رشتے کے لیے ہمارے گھر بھیجے۔

اسی طرح حارث نے بھی اپنے گھر والوں کو اس رشتے پر امادہ کر لیا اور اس نے اپنے

والدین کو ثمن کا رشتہ لینے کے لیے بھیجا۔

ثمن کے والدین کو رشتہ پسند آ گیا کیونکہ حارث کا خاندان بھی خاصہ امیر تھا۔ رشتہ اُن کی برابری کا تھا۔ اب دو انجان خاندانوں میں رشتے داری قائم ہونے جا رہی تھی۔ ثمن اور حارث کی انگیجمنٹ دھوم دھام سے ہوئی دونوں بے حد خوش تھے۔

انگجمنٹ کے کچھ ہی دنوں بعد ثمن کے والد پریشان دکھائی دینے لگے۔ ثمن نے پوچھا تو کہنے لگے کہ انہیں کاروبار میں نقصان ہوا ہے جس کی وجہ سے انہیں یہ گھر بیچنا پڑا اور ایک مہینے کے اندر اندر یہ گھر خالی کرنا پڑے گا۔

یہ بات سنی تھی کہ ثمن کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اُسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا اُسے اب اس آرام دہ شان وشوکت کی زندگی کی بجائے ایک عام سی زندگی گزارنا ہوگی۔

اگلے روز ثمن یونیورسٹی میں بھی خاموش خاموش سی تھی حارث کے ایک دو بار پوچھنے پر تو اس نے کچھ نہ بتایا لیکن جب حارث نے اصرار کیا تو ثمن نے اپنا سر حارث کے کندھوں پر رکھا اور بچوں کی طرح سسکنے لگی۔ حارث نے ثمن کو دلاسہ دیتے ہوئے اس سے پوچھا:

''آخر بات کیا ہوئی ہے کچھ تو بتاؤ۔''

ثمن نے آہستہ آہستہ خود کو سنبھالا اور ساری بات حارث کو بتائی۔

''خدا کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے تم صبر سے کام لو۔''

حارث نے ثمن کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا اور اُس کی بھیگی پلکوں پر ٹپکتے ہوئے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں سے صاف کیا۔

اب ثمن اور اُس کے والدین ایک کرائے کے گھر میں شفٹ ہو چکے تھے۔ کرائے کے گھر میں زندگی گزارنا ثمن کے لیے کسی عذاب سے کم نہ تھی لیکن وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ قسمت میں جیسا لکھا ہوتا ہے ویسا ہی ہوتا ہے۔

ثمن کے والدین کو چند دن کے لیے دوسرے شہر جانا پڑا تین دن بعد وہ واپس آ رہے تھے کہ اُن کی گاڑی ایک حادثے کا شکار ہوگئی اور دونوں موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے۔

ثمن کی زندگی کی کشتی طوفانوں کے بھنور میں پوری طرح پھنس چکی تھی وہ اس حادثے کے بعد بالکل اکیلی سی ہوگئی والدین کی وفات کے صدمے سے ثمن بجھ سی گئی تھی۔

اب وہ کرائے کے مکان میں بھی زیادہ دیر نہ رہ سکی کیونکہ کرایہ وقت پر نہ دینے کی وجہ سے مالک مکان نے گھر خالی کروالیا۔ انہی دنوں ثمن نے یونیورسٹی جانا چھوڑ دیا۔

اب ثمن کی ایک چچی اُسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئی۔ وہ ثمن سے دن رات کام کرواتی۔ حارث سے بھی رابطہ ہوئے کافی دن گزر چکے تھے۔ ایک دن حارث کا میسج آیا کہ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ ابھی امید کی کرن پیدا ہی ہوئی کہ ثمن کی امی نے اُسے جھنجھوڑتے ہوئے اُٹھایا۔

''اُٹھو بیٹا ۹ بج رہے ہیں یونیورسٹی نہیں جانا کیا؟''

قلم قرطاس ادبی مجلس کے تحت تقریب پذیرائی کا اہتمام

قلم قرطاس ادبی مجلس شعبۂ اُردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد کے تحت (۲۸ را کتوبر ۲۰۱۵ء) کو ڈاکٹر نواز کنول اور ڈاکٹر عمران ظفر کی تازہ تصانیف کی تقریب پذیرائی کا اہتمام کیا گیا جس میں نظامت کے فرائض حافظ عامر شہزاد، تلاوت حافظ ذیشان غوری اور نعت رسول مقبول ﷺ کی سعادت محمد بلال نے حاصل کی۔

اس کے بعد مہمانِ اعزاز ڈاکٹر نواز کنول اور ڈاکٹر عمران ظفر کی تصانیف پر مقالہ جات پڑے گئے۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر اجمل دانش، ڈاکٹر صدف نقوی، پروفیسر ماجد مشتاق، ڈاکٹر اصغر علی بلوچ اور ڈاکٹر سعید احمد شامل ہیں۔ اس کے بعد مہمانِ اعزاز ڈاکٹر نواز کنول اور ڈاکٹر عمران ظفر نے اپنی تصانیف پر نہایت جامع الفاظ میں گفتگو کی۔ آخر پر صدر شعبہ اُردو ڈاکٹر آصف اعوان صاحب نے مہمانِ اعزاز کا شکریہ ادا کیا اور ان کو اعزازی شیلڈ سے بھی نوازا اور صدر شعبہ جناب ڈاکٹر آصف اعوان نے اپنے خطاب میں قلم قرطاس ادبی مجلس کے منتظمین کی اس کاوش کو سراہا اور ایسے ادبی پروگرامات کو مزید بہتر اور مؤثر طریقے سے منعقد کرنے پر زور دیا۔ اس موقع پر شعبہ اُردو جی سی یونیورسٹی فیصل آباد کے اساتذہ کرام اور طلبا کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

حافظ حیاتؔ

حادثہ

چوتھا دن بھی گزر گیا اس نے مجھے کال یا (SMS) تک نہیں کیا وہ تو میرا آشنا تھا میرے مزاج کو سمجھتا تھا آخر کیا ہوا کہ اس نے اچانک ہی رابطہ ختم کر دیا۔ میں اپنی یادداشت پر زور دیا تو لا شعوری حصے میں یہ بات نظر آئی کہ آخری بار جب اس نے میرے مسلک کے متعلق پوچھا تھا کہ آپ کس مسلک سے تعلق رکھتے ہیں؟۔ آپ کی برادری کیا ہے؟

برادری کو تو اس نے سرسری طور پر نظر انداز کر دیا کہ میں اس کے لیے اجنبی تھا لیکن مسلک کو میں زیر بحث لانا نہیں چاہتا تھا مگر اس کے بار بار اصرار پر بتانا پڑا کہ میرا کسی مسلک سے تعلق نہیں ہے ہاں فلاں عالم دین کے نظریات سے کافی حد تک اتفاق رکھتا ہوں بس پھر کیا تھا کہ مسلکی تعصب نے کئی سالوں کے بعد جو ہم مزاج ملایا تھا ہمیں اس کی بھی قربانی دینا پڑی۔

طارق نے لمبی سانس لیتے ہوئے حمزہ سے کہا بہت افسوس ہوا یہ سن کر۔۔۔

حمزہ! تمہیں افسوس ہے اور ہمیں زندگی میں کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جب انسان کسی سے کچھ امیدیں وابستہ کر لیتا ہے تو امیدیں ٹوٹ کیوں جاتی ہیں۔؟

طارق: حمزہ تم یہ بتاؤ اسے کیسے جانتے ہو۔؟

حمزہ: فیس بک پر میری شاعری پر اس نے اپنا تبصرہ لکھا اور پھر پتہ نہیں کیسے وہ مزاج میں سماتی گئی۔ اس نے مجھے فیس بک پر (SMS) کر کے رابطہ نمبر حاصل کیا اور یوں بات کال تک جا پہنچی کچھ دن بات ہوتی رہی یوں محسوس ہوا جیسے ہم صدیوں سے ایک دوسرے کے مزاج میں رچ بس رہے ہو۔ مگر یہ سب کچھ میرا وہم ثابت ہوا جب اس نے آخری بار کال کی تھی اور بار بار میرا مسلک پوچھنا چاہا میرے بار بار انکار پر ناراض ہونے کی دھمکی دی میں نے بھی مشرقی روایات کے تقاضے پورے کرتے ہوئے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور بتا دیا، یہ بھی بتایا کہ اپنے گھر کے قریب

جو مسجد ہے جب خدا توفیق دیتا ہے اسی مسجد میں سجدہ ریز ہوتا ہوں۔

شاید اس کا مسلک مسجد والوں کے برخلاف تھا مسجد کا نام سنتے ہی اس نے کہا ''تم کو کوئی اور مسجد نہیں ملی تھی۔''

میں نے کہا مسجد تو اللہ کا گھر ہوتا ہے۔ پہلی بار مجھے اپنے آشنائی کے قلعے میں دراڑیں اسی دن پڑتی نظر آ گئی تھی اس نے مزید چھان بین کرتے ہوئے پوچھا کہ تم نے کبھی کسی عالم کی گفتگو سنی ہے۔؟ میں نے کہا کبھی کبھی فلاں کی بات سن لیتا ہو وہ بھی اس کے اندازِ خطابت کی وجہ سے۔ میری شومئ قسمت کہ وہ اس مقرر کے مسلک کے بھی خلاف تھی۔

طارق ہنستے ہوئے حمزہ سے کہتا ہے کہ تیری بھی کیا قسمت ہے ابھی بات مکمل نہیں ہوئی۔

اچھا اچھا بتاؤ (طارق نے کہا)۔

اس نے مجھ سے میرے گھر کا پتا بھی کچھ دن پہلے لے لیا تھا اس غرض سے کہ ہم مشرقی روایات کو بھرپور انداز سے زندہ رکھ سکیں۔ ایک دن بعد اس کا خط ملا خط پڑھتے ہی نہ جانے کیوں اپنائیت کے احساس نے مجھے آن جکڑا اور اس یہ بھی لکھا تھا کہ میں آئندہ آپ سے کبھی بات نہیں کر پاؤں گی کیونکہ آپ کا اور میرا مسلک ایک نہیں ہے۔ حالانکہ میرا تعلق تو کسی کے ساتھ بھی نہیں تھا پھر مجھے میری اس بات نے نادم کیا کہ میں نے ایک ''مشرقی روایات کی پاسدار'' لڑکی کو جو اپنی تہذیب و ثقافت سے آشنا ہے اس کو فون پر بات کرنے پر مجبور کیا یقیناً کسی گناہ سے کم نہیں تھا یہ وہ احساس تھا جس نے مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا تھا یہ الگ بات کہ اس کی فرینڈ لسٹ میں کچھ مرد حضرات تھے لیکن ہماری قسمت تھی کہ اس نے ہمارے ہی سینے پر ''اجنبی'' اور ''غیر'' کے تغمے سجنے تھے۔

طارق تو بتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جب انسان کو اپنے مزاج کا انسان ملتا ہے تو وہ ذات پات، مسلکی اختلافات کی بھینٹ اپنے رشتوں کو کیوں چڑھاتا ہے کیا وہ صرف ایک انسان اور مسلمان بن کر زندگی نہیں گزار سکتا۔؟ کیا اس کے نزدیک انسان کی اپنی کوئی پہچان نہیں۔؟

واہ رے قسمت! اتنے سالوں بعد اس معاشرے میں اگر ایک انسان ملا بھی تو روایات کا پاسدار۔ اس نے بھی ہماری ہمدردی کو کو بے دردی سے پامال کیا اب ہم کسی بھی انسان پر اعتماد نہیں کریں گے۔

طارق: نہیں ایسی بات نہیں ہے اس کا نظریہ اپنی جگہ پر تم بس اپنے دل میں سب کے لیے

''محبت فاتحِ عالم'' کا سبق یاد کرتے رہو، فتح تمہاری ہوگی۔ ابھی طارق بات کر ہی رہا تھا کہ موبائل پر (SMS) آیا، اسی ''مشرقی روایات کی پاسدار'' لڑکی کا۔

''حمزہ! مجھے یہ جان کر انتہائی خوشی ہوئی ہے کہ تم صوفی وملاء کی اندھی تقلید نہیں کرتے بلکہ خود جاننے کی کوشش کرتے ہو اور میں تو تمہیں آزما رہی تھی کہ تم مسلکی تعصّبات پر یقین تو نہیں رکھتے؟ میں کل تمہارے شہر آرہی ہوں مجھے تم سے ملنا ہے کیونکہ بڑی مدت بعد تم سا کوئی آشنا ملا''

طارق نے اس کا (SMS) سن کر کہا کہ میں نے کہا تو تھا کہ فتح تمہاری ہوگی۔ اب حمزہ کی بے چینی اور بھی بڑھ گئی کیونکہ کل کس نے دیکھی ہے جس میں کسی کا وصال نصیب ہوتا ہے۔۔۔

حمزہ اب وہ یہ سوچنے لگا کہ میں کل اس سے کیا بات کروں گا وہ الفاظ کا انتخاب کر کے اپنے دماغ میں ترتیب دینے لگ گیا اور پھر اس نے کل کے لیے اپنے کپڑوں کو تیار کیا اور کل کا بے صبری سے انتظار کرنے لگا۔ اور اس کی آنکھ لگ جاتی ہے وہ خواب میں دیکھتا ہے کہ نازش اپنے گھر والوں کے ساتھ شہر آنے کے لیے گاڑی میں روانہ ہوتی ہے اور وہ بھی آنکھوں میں سہانے خواب سجائے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوتی ہے اور شہر سے دور تھوڑا ہی فاصلہ طے کرتی ہے کہ راستے میں گاڑی کی اچانک بریک لگتی ہے تو گولیوں کی زوردار آواز سنائی دے رہی تھی کچھ ہی دیر بعد پولیس کی گاڑیاں وہاں پہنچتی ہیں تو نازش نے بھی گاڑی میں جھانکا کہ سڑک پر تین لاشیں پڑی تھی اور لوگ باتیں کر رہے تھے کہ:

''یہ صاحب فلاں جماعت کے لیڈر تھے ان کی بڑی پاور تھی اب پتا نہیں کیا ہوگا''

اس حادثے کی خبر الیکٹرانک میڈیا کی بدولت پورے ملک میں آگ کی طرح پھیل گئی اور لوگوں نے توڑ پھوڑ شروع کر دی ابھی ان کی گاڑی واپس مڑی ہی تھی کہ لوگوں کے ایک ہجوم نے ان کی گاڑی پہ حملہ کر دیا اور گاڑی کے افراد کو تشدد کا نشانہ بناتے ہوئے گاڑی سے نکال کر گاڑی کو آگ لگا دی، افراتفری اور جلدی میں نازش کا موبائل گاڑی میں ہی گر گیا اور اس کے ارمانوں کی طرح اس کا موبائل بھی جل گیا۔ اتنی دیر میں حمزہ کی آنکھ کھل گئی اور ساتھ والے کمرے میں ٹی وی پر بالکل اس کا خواب سچ ہو چکا تھا۔

اب حمزہ حیرت کا پیکر بنا ٹی وی دیکھتا ہے اور (SMS) کے انتظار میں دیوار کے ساتھ لگ جاتا ہے اور موبائل اس کے ہاتھ سے گر کے ٹوٹ جاتا ہے۔

ڈاکٹر سعید احمد

پلنگ پر چیتا

(۱)

پنجابی کہاوت ہے کہ عقل کے بغیر موجیں ہی موجیں ہیں، گویا لاعلمی اور بیوقوفی بھی ایک نعمت ہے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب اس نعمت سے مالا مال ہوا کرتے تھے (اور آج بھی ہیں)۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ کچھ عرصہ پہلے مجھے فارسی پڑھنے کا شوق چرایا۔ کتابیں ناپیدہ استاد ندارد۔ پڑھنے کی کوئی سبیل نظر نہ آئی۔ کہیں کوئی فارسی شعر لکھا نظر آتا تو فوراً رَٹ لیتا۔ نہ الفاظ کی پہچان، نہ معانی کی سدھ بدھ۔ شعر پڑھنے میں بڑی دِقت پیش آتی۔ انکل پچو سے ترجمہ کر لیتا۔ کبھی ترجمہ بھول جاتا اور کبھی شعر غر بود ہو جاتا۔

ایک واقعہ مجھے ابھی تک یاد ہے۔ ایک دوست نے پہلے پہل سعدؔی کے ایک مشہور شعر کا ترجمہ پوچھا۔ شعر یہ تھا:

ہر بیشہ گماں مبر کہ خلیست
شاید کہ پلنگی خفتہ باشد

مجھے ترجمہ یاد نہ تھا، لیکن لاعلمی کا اظہار میری (طالب) علمانہ شان کے منافی تھا۔ پھر میرا دوست میرے تبحر علمی کا دم بھی تو بھرتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں نے ترجمہ نہ بتایا تو میرے پندار کو ٹھیس لگ جائے گی۔ میں نے اپنی پریشانی پر قابو پاتے ہوئے کہا ''بھئی اس میں کیا مشکل ہے اگر ترجمہ کرتے ہوئے دقیق الفاظ کے معانی پر غور کرو گے تو گرہیں خود بخود کھلتی چلی جائیں گی۔

دیکھو گماں کے معنی شک اور خیال کے ہیں، بر سے پہلے جو میم لگا ہوا ہے وہ نفی کا اظہار کرتا ہے، سمجھ گئے ناں؟ میرے دوست نے برا خفش کی طرح سر ہلایا تو میں نے پھر سمجھانا شروع کر دیا۔

''ہاں تو بیشہ کے معنی جنگل کے ہیں۔ اکبر کا شعر ہے:

صناعی کے چلاؤ تیشے تا کہ کٹیں افلاس کے پیشے

(داد طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) اور خلیست کے معنی تو صاف ظاہر ہیں تو پہلے مصرعے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ خیال نہ کرو کہ ہر جنگل خالی ہوگا اور دوسرا مصرع تو بہت ہی آسان ہے۔ پلنگ کے معنی تو کوئی جاہل بھی بتا سکتا ہے یعنی چارپائی یعنی گھاٹ جس پر سوتے ہیں ہیں درخفتہ کے معنی سویا ہوا کے ہیں تو دوسرے مصرعے کا کیا مطلب ہوا بھلا۔

میرا دوست چھت کو گھورنے لگا۔ ''بھئی! تم تو بالکل کندہ ناتراش ہو۔ اتنی سی بات بھی سمجھ میں نہیں آ رہی۔ ذرا پہلے مصرعے کو ساتھ ملا کر پڑھو۔ فوراً مطلب ظاہر ہو جائے گا۔ یہ خیال نہ کرو کہ ہر جنگل خالی ہوگا شاید وہاں کوئی پلنگ پر سو رہا ہو۔''

''جی کیا مطلب؟ جنگ میں سونے کی کیا تک ہے اور وہ بھی پلنگ پر اور کون سو رہا ہے پلنگ پر؟'' میرے دوست نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''کیوں جی! جنگل میں سونے کی تک کیوں نہیں۔ بھئی نیند تو پھانسی کے تختے پر بھی آ جاتی ہے اور جنگل میں سونے پر پابندی ہے کیا؟ اب رہی یہ بات کہ پلنگ پر کون سو رہا ہے تو یہ بات شاعر نے قاری پر چھوڑ دی ہے۔ شعر میں ہر بات کی تفصیل بیان نہیں کی جاتی۔ اپنے ذہن پر زور دو، کوئی مسافر ہوگا یا پھر کوئی راہزن۔ راہزن کے معنی تو جانتے ہوں گے آپ؟''

''جی! راہزن کے معنی چور، ڈاکو کے ہیں۔'' دوست نے جواب دیا۔

''شاباش'' میں نے کہا۔ ''لیکن یہ تو راہزن کے لغوی معنی ہیں لغوی معنی جانتے ہو؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

دوست نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''بھئی! راہ زن کے لغوی معنی راہ میں بیٹھنے والی عورت کے ہیں یعنی بازاری عورت اور سعدیؔ کا اشارہ غالباً اسی طرف ہے۔''

''عورت وہ کیسے؟'' میرے دوست نے لغوی اور لغوی کی بھول بھلیوں سے نکلتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔

''بھئی! دیکھو ناں چور ڈاکو جان و مال لوٹتے ہیں اور بازاری عورتیں جان و مال کے ساتھ متاعِ ایمان بھی لوٹ لیتی ہیں۔ جان و مال تن کی دولت اور دین وایمان من کی دولت۔

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں میں آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

''ذرا یہ بتاؤ تن کی دولت زیادہ اہم ہے یا من کی دولت؟''

''من کی دولت''، میرے دوست نے بلا سوچے سمجھے جواب دیا۔

''اور ہاں سعدی اور اقبال کے خیالات میں بڑی مطابقت پائی جاتی ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سعدی کا اشارہ بازاری عورت ہی کی طرف ہوگا چور ڈاکو کی طرف ہرگز نہیں ہوسکتا۔''

میں اپنے دوست کی بے اطمینانی دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ قائل ہوا، کچھ نہ ہوا، لیکن اثبات میں سر ہلاتا رہا، مجھے اس کی کم علمی پر ترس آرہا تھا۔ میں نے علم پروری اور دریا دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے چائے کی دعوت دی جو اس نے فوراً قبول کر لی۔ چائے پیتے ہوئے میں نے اسے تسلی دی کہ تشنگانِ علم کے لیے میرے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں، لیکن پیاسے ہی کو کنویں کے پاس آنا پڑتا ہے۔ کنوں چل کر پیاسے کے پاس نہیں آتا۔

میرا دوست گاہے گاہے فارسی اشعار کا مطلب پوچھنے میرے پاس آتا اور علم کی پیاس کو چائے سے بجھاتا۔ میں پورے ذوق وشوق سے شعر کے سمندر میں کود جاتا اور گھنٹوں غواصی کے بعد ایسے ایسے لؤ لوئے آبدار ڈھونڈ کر لاتا کہ وہ اپنی دریافت پر خود ہی دیر تلک سر دھنتا رہتا۔ میرا دوست اس دوران میں پورے زور وشور سے چائے نوش کرتا۔ بسکٹ کھاتا اور سر ہلاتا جاتا۔ اِدھر تشریح ختم ہوتی اُدھر چائے کی پیالی۔

میرا دوست پھر آنے کا مژدہ سنا کر چل دیتا۔ اُس کے جانے کے بعد میں مسند علم سے اتر کر پلنگ پر بیٹھ جاتا اور سر نیہوڑائے خرد کی گتھیاں سلجھانے لگا۔ بیشہ، پلنگ اور خفتہ کی مثلث کا مسئلہ کسی طرح حل نہ ہوتا۔ آخر کار میں نے فیثا غورث کی تلاش شروع کر دی۔

(۲)

جو بندہ یابندہ۔ مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مفتی صاحب فارسی ادب کے استاد ہیں اور مجھ پر بہت شفقت فرماتے ہیں۔ میری کم علمی کا مذاق نہیں اُڑاتے اور میرا حوصلہ بڑھاتے رہتے ہیں۔ مفتی صاحب چائے پلاتے ہیں اور بسکٹ بھی کھلاتے ہیں۔

''جناب! ایک شعر کا مطلب پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''پوچھیے۔'' مفتی صاحب نے پیار سے کہا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے پنجابی لہجے میں فارسی شعر پڑھا:

ہر بیشہ گماں مبر کہ خلیست
شاید کہ پلنگی خفتہ باشد

''یہ گمان نہ کرو کہ ہر جنگل خالی ہوگا شاید کوئی چیتا وہاں سو رہا ہو۔'' مفتی صاحب نے جھٹ ترجمہ بتا دیا۔

''چیتا!'' میں زیرِ لب بڑبڑایا۔ ساری گتھیاں ایک آن میں سلجھ گئیں۔ میں نے گوہر مقصود یعنی چیتے کو بغل میں دبایا اور گھر کی طرف چل پڑا۔ نجانے مفتی صاحب کی باتوں میں زیادہ مٹھاس تھی یا چائے میں۔ میں مفتی صاحب کا گرویدہ ہو گیا۔

(۳)

فارسی اور عربی شاعری میں چیتے کا ذکر کثرت سے ملتا ہے، لیکن اُردو شاعری میں اس کا ذکر کم کم ہے۔ اردو شاعری کا جنگل کنجشک و حمام، زاغ و زغن، روباہ و آہو، بلبل و طاؤس اور گوسفند و شغال کی آہ و پکار اور چیخم دھاڑ سے گونج رہا ہے، لیکن چیتے کی دھاڑ اور غراہٹ کا دور دور تک پتہ نہیں چلتا۔ چیتا بلاشبہ جنگل کا خوبصورت ترین درندہ ہے۔ چھوٹا سا سر دو بڑی بڑی روشن آنکھیں، پتلی کمر، دبلی لیکن مضبوط ٹانگیں، خوبصورت لمبی دم اور زرد کھال پر سیاہ دھبے۔ چیتا دیکھنے میں بڑا بارعب اور مسحور کن لگتا ہے۔ چیتے کا تعلق بلی کے خاندان سے ہے۔ یہ جنگل کا بادشاہ ہے۔ عیاری اور برق رفتاری میں کوئی دوسرا جانور اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جب چیتا اپنے شکار پر جھپٹتا ہے تو اس کی رفتار سو کلو میٹر فی گھنٹہ سے بھی بڑھ جاتی ہے۔

(۴)

ایک دن میں قلم کمان ہاتھ میں لے کر دھیان کے گھوڑے پر سوار ہو، ریختے کے جنگلوں میں چیتے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اُدھر دکن کی جانب بہت سے ہرن، گورخر، بھیڑیئے، لومڑ اور گیدڑ نظر آئے، لیکن چیتے کا سراغ نہ ملا۔ شمالی ہند میں ریختے کا جنگل بہت گھنا اور خطرناک تھا۔ جگہ جگہ ڈھاک پھولا ہوا تھا۔ سرخ سرخ پتوں پر کسی آدم خور چیتے کے خون آلود پنجوں کا گمان ہوتا، لیکن قدموں کے نشانات سے میں کسی چیتے تک نہ پہنچ سکا۔

اُردو کی منظریہ شاعری میں ہمالیہ کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ ہمالیہ کی برف پوش

چوٹیاں آسمان سے سرگرم سخن ہیں۔ فراز کوہ سے جھرتے ہوئے جھرنے اور چہکتے ہوئے پرندے جنت ارضی کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ہمالیہ سے متعلق بہت سی خوبصورت نظمیں ہیں، لیکن ہمالیہ کی چوٹیوں اور ترائی میں پائے جانے والے برفانی چیتے کی دھاڑ کہیں سنائی نہیں دیتی۔ برفانی چیتا نسل کشی کے شدید خطرے سے دوچار ہے۔ برفانی چیتے کی کھال کشمیر میں سرعام بکتی نظر آتی ہے۔

(۵)

ریختے کے جنگلوں میں میرا گزر ایک ایسے قبیلے پر ہوا جسے دیکھ کر رخش خیال ہنہنانے لگا۔ یہ انوکھے شاعروں کا قبیلہ تھا۔ ان کے تخلص عجیب اور حلیے غریب تھے۔ عیاش، اوباش رنگین نازنین اور بیگم وغیرہ سب مرد تھے، لیکن مردم بیزار۔ ان کی وضع قطع ہی زنانہ نہ تھی بلکہ لب ولہجہ بھی زنانہ تھا۔ وہ ریختہ میں نہیں ریختی میں باتیں کرتے تھے۔ وہ اکثر عورتوں کے متعلق باتیں کرتے، سوت کاتتے اور ہرن کی دردناک چیخیں سنتے، لیکن چیتے کا ذکر سن کر تھر تھر کانپنے لگتے، حالانکہ ہرن اور چیتے کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ دراصل چیتے کو غزلیں سننے کا بڑا شوق ہے، وہ ہرن سے فرمائش کرتا ہے لیکن ہرن چیتے کی فرمائش پر بالکل کان نہیں دھرتا، بلکہ چیتے کو دیکھتے ہی قلانچیں بھرنے لگتا ہے۔ ادھر چیتا بھی بڑا ہٹ دھرم واقع ہوا ہے، وہ کہتا ہے کہ میں بھی ہرن سے غزل سن کر رہوں گا۔ آخر کار چیتا برق رفتاری سے آہوئے رمیدہ پر جھپٹتا ہے اور اس کا ٹینٹوا دبا کر غزل سنتا ہے۔ غزل سننے کے بعد چیتے کو اچانک کلیم الدین احمد کی بات یاد آجاتی ہے کہ غزل ایک نیم وحشی صنف سخن ہے اس کی گردن مروڑ ڈالنی چاہیے۔ چنانچہ چیتا اس صنفِ نازک کی گردن مروڑ ڈالتا ہے۔

چیتا اکثر غزالہ تبیتا اور ریما سے جبراً غزل سنتا رہتا ہے۔ غزل سننا چیتے کی فطرت ہے جو تبدیل نہیں ہوسکتی۔ انگریزی کہاوت ہے:

"Can a leapord change his spots?"

کیا چیتا اپنے دھبے تبدیل کرسکتا ہے؟ ایک ضرب المثل ہے کہ موسلا دھار بارش بھی چیتے کے دھبے نہیں دھوسکتی۔ چیتے کی یہی فطرت غزل گو شعرا کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ وہ چیتے کے خلاف زہر افشانی کرتے رہتے ہیں۔ اکثر شاعر بھیڑ، بکری اور ہرن جیسے معصوم جانوروں کی شان میں تو قصیدے، مثنویاں اور غزلیں لکھتے رہتے ہیں لیکن شاہین، شیر اور چیتے جیسے خونخوار اور طاقتور جانوروں کا ذکر بالکل پسند نہیں کرتے۔ قافیے یا ردیف کی مجبوری سے اگر انہیں ان جانوروں کا ذکر

کرنا پڑ جائے تو ان میں بھی اپنے پسندیدہ جانوروں کے چیدہ چیدہ اوصاف پیدا کر دیتے ہیں۔ اکثر شاعر چیتے اور شیر کو حافظ کی بوڑھی بھیڑ یا اخفش کی بکری بنا دیتے ہیں۔

ابھی تک یہ فیصلہ تو نہیں ہو سکا کہ بنی نوع انسان کو سب سے زیادہ نقصان درندوں نے پہنچایا یا خود انسان نے، البتہ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ درندوں کو سب سے زیادہ نقصان حضرتِ انسان ہی نے پہنچایا ہے۔ مثلاً کچھ ریختہ گو یا ریختی گو شعراء نے چیتے کے دانت اکھاڑ ڈالے تو کچھ نے چیتے کی آنکھیں نکالی لیں۔ کچھ شاعر ہاتھ دھو کر چیتے کے پنجوں کے پیچھے پڑ گئے تو کچھ اس کی کمر ہی لے اُڑے یہ اعضائے رئیسہ وغیرہ رئیسہ انہوں نے اپنے اپنے محبوبوں کی نذر کر دیئے۔ ا جلالی تحائف کی وصول یابی کے بعد اُردو غزل کا روایتی محبوب تو شیر بن بیٹھا اور عاشق رہا وہی بکری کی بکری۔ اب دونوں کبھی ایک گھاٹ پر پانی نہیں پیتے۔ (دھوبی گھاٹ میں چائے پیتے ہیں۔)

غزل کے محبوب نے اپنے عاشق سے شمشیر یعنی شیر کے ناخن تو لے لیے لیکن عقل کے ناخن نہ لیے اس لیے محبوب ہر وقت عاشق کے بخیے اُدھیڑنے کے لیے بے قرار رہتا ہے۔ اب عاشق کی اپنے خونخوار محبوب کو دیکھتے ہی گھگھی بندھ جاتی ہے۔ خطرہ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ عاشق محبوب کے گھر تو کیا اس کی گلی میں بھی قدم نہیں رکھتا۔ مبادا وہ اسے کچا چبا جائے۔

کچا چبانے کے ذکر پر مجھے فوراً وہ کہانی یاد آ جاتی ہے جس میں بتایا گیا تھا کہ پہلے پہل چیتا آگ کے استعمال سے واقف تھا اور وہ ہمیشہ بھنا ہوا گوشت کھاتا تھا۔ ایک بار ایک چیتے کو برازیل کے بارانی جنگلات میں ایک لڑکا نظر آیا جو بے یار و مددگار اور بھوک سے نڈھال تھا۔ لڑکے کا تعلق آدمخور قبائل سے تھا جو انسانوں کو کچا چبا جاتے تھے۔ چیتے نے لڑکے پر رحم کھایا اور کئی سال تک لڑکے کی پرورش کی اور اسے بھنا ہوا گوشت کھلاتا رہا۔ ایک دن لڑکے نے موقع پا کر چیتے کی بیوی بچوں کو مار ڈالا اور آگ چرا کر اپنے قبیلے کی طرف بھاگ گیا۔ اس دن سے آج تک چیتے کو اپنا شکار کچا ہی چبانا پڑتا ہے جبکہ آدمخور انسانوں کو بھون کر مزے مزے سے کھاتے ہیں۔

ریختی گو شعرا کی طرح کچھ ابہام گو شعرا بھی چیتے پر طبع آزمائی کرنے لگے۔ اکثر ابہام گو شاعر اپنے محبوب کے کمرے کو چیتے سے تشبیہ دیتے ہیں اور اگر ان کا محبوب معدے کی گرانی، سینے کی جلن یا کسی ناگفتہ بہ مرض کے باعث چارپائی پر بے چینی سے کروٹیں بدل رہا ہو تو جناب شاعر حسن ظن اور حسن تعلیل سے کام لیتے ہوئے کچھ یوں ارشاد فرمائیں گے:

وصل کی شب پلنگ کے اوپر
مثل چیتے کے وہ مچلتے ہیں

جب ریختے کے جنگلوں میں کوئی باگھ، یا چیتا نظر نہ آیا تو میں نے تھک ہار کر شکار کا ارادہ ترک کرنا چاہا۔ اسی اثناء میں مشرق کی نیستاں میں ایک چیتے کا بڑا شہرہ ہونے لگا۔ یہ شیرِ مشرق عالی ہمت ہے کہ اپنے دشت جنوں میں جبریل کو بھی صید زبوں سمجھتا ہے اور اپنی کمند شوق سے یزداں کو بھی شکار کرنا چاہتا ہے۔ شیرِ مشرق اپنے کردار و عمل اور اپنے کلام سے اپنی قوم کو بہادری و جانبازی کا درس دیتا ہے۔ وہ پیمبرِ خودی ہے۔

خودی شیرِ مولا جہاں اس کا صید
زمیں اس کی صید آسماں اس کا صید

وہ شیر کی ایک دن کی زندگی کو گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر سمجھتا ہے۔ اس کے آئین میں جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات ہے۔ شیرِ مشرق چیتے کی شان میں لکھتا ہے:

چیتے کا جگر چاہیے شاہیں کا تجسّس
جی سکتے ہیں بے روشنیِ دانش و فرہنگ

ملے گا منزلِ مقصود کا اسی کو سراغ
اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ

(۶)

چند دن پہلے میرا دوست چاہِ علم پہ اپنی پیاس بجھانے کے لیے آیا تو آتے ہی میری شان میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگا۔ ''جناب آپ تو فارسی زبان و ادب میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ خاص کی اشعار کی تشریح و تحسین میں آپ جس دِقت نظری اور نکتہ شناسی کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ آپ کی سخن فہمی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

''دریں چہ شک؟'' میں نے آہستگی سے کہا دوست کو چائے پیش کرتے ہوئے میں نے کہا: ''برادرم! میں آپ کی قدر شناسی کا ممنون ہوں لیکن من آنم کہ من دانم۔ آپ کیوں مجھ کج فہم زبان پنبہ دہان کو کانٹوں میں گھسیٹے ہیں۔ کہاں فارسی اور کہاں میں۔ کجا رام رام اور کجا ٹیں ٹیں

ویسے فارسی بہت شیریں اور آسان زبان ہے۔یعنی کہ رفت گیا اور بود تھا لیکن آج کل تو فارسی کا چلن اُٹھ گیا ہے۔

پڑھیں فارسی بیچیں تیل
یہ دیکھو قدرت کے کھیل

میری تقریر دلپذیر ابھی جاری تھی کہ دوست نے قطع کلامی کی معافی چاہتے ہوئے ایک شعر کا مطلب پوچھا:

کیا چیتنے کا فائدہ جب شیب میں چیتا
سونے کا سماں آیا تو بیدار ہوا میں

شعر سنتے ہی میں چکرا گیا۔ یا الٰہی! یہ چیتنے کیا بلا ہے شاید چیتے ہی کی کوئی قسم ہوگی اور بھلا یہ ''شیب'' کیا لفظ ہوا شاید اس کا تعلق شب سے ہے، کیونکہ دوسرے مصرعے میں سونے کا ذکر ہے، رات تو سونے کے لیے ہی ہوتی ہے۔''رات بنائی تو نے نیند بھرنے کوٗ'، لیکن بیدار ہونا؟ ہاں! رات شریروں کے لیے دن ہے ذہن میں گنجھل پڑنے لگے۔شب، پلنگ، چیتا، پھر وہی برموداٹرائی اینگل۔

آخر کار میں نے سر کھجاتے ہوئے بیزاری سے کہا''یار یہ کیا تم ہر بار ایک عدد چیتا بغل میں دبا کر لے آتے ہو اور بھی جانور ہیں دنیا میں چیتے کے سوا۔ چیتا نہ ہوا پوست کے کھیت کا خرگوش ہوا۔کبھی جنگل میں چیتا، کبھی غزل میں چیتا اور کبھی پلنگ پر چیتا۔''

مدیحہ سعید

مٹی کا قرض

ادارتی نوٹ

سب سے پہلے تو میں محترم محمد مزمل صدیقی کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنی تصنیف ''مٹی کا قرض'' کی صورت میں بے حد قیمتی تحفے سے نوازا۔ شکریہ! محترم محمد مزمل صدیقی کو اُن کی تصنیف ''مٹی کا قرض'' کی کامیاب اشاعت کے ساتھ ادبی دنیا کے اُفق پر کامیاب آمد پر بہت زیادہ مبارک باد۔ یہ بات قابل فخر ہے کہ محمد مزمل صدیقی جیسے ہونہار طالب علم نے شعبہ اُردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی میں آنے سے پہلے ہی نوعمری میں ہی تخلیقی کتاب لکھ دی جس پر وہ بہت زیادہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ میں پُر امید ہوں کہ مزمل صدیقی شعبۂ اُردو میں آکر علم کے حصول کے ساتھ ساتھ لکھنے کے عمل کو جاری رکھتے ہوئے شعبہ کی عزت میں اضافے کا باعث بھی بنیں گے۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک کی بابرکت ذات زورِ قلم اور زیادہ کرے۔

تبصرہ

مزمل صدیقی نوعمر قلم کار ہیں۔ اگر بچوں کے ادب پر ایک وسیع نظر ڈالی جائے تو تقریباً دنیا کے ہر کونے میں بچوں کا ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ اسی سلسلے کو بڑھاتے ہوئے مزمل صدیقی نے بچوں کی کہانیوں پر مشتمل کتاب ''مٹی کا قرض'' تخلیق کی۔ اس قسم کی کہانیاں لکھنے کا اصل مقصد بچوں کی بہتر تربیت کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس کم عمری میں یہ فریضہ ادا کرنے کی کوشش محمد مزمل صدیقی جیسے ہونہار طالب علم کا ہی کام ہو سکتا ہے۔

محمد مزمل صدیقی کے مجوزہ مجموعہ ''مٹی کا قرض'' میں کل 16 کہانیاں شامل ہیں۔ (۱) مٹی کا قرض، (۲) گھر پیارا گھر، (۳) آؤ دیا جلائیں، (۴) استاد صاحب، (۵) ضمیر کی آواز، (٦) دستک، (۷) کمشنر صاحب، (۸) قلفی فروش، (۹) میرے پاپا، (۱۰) عمرو عیار خطرناک مہم پر،

(۱۱)معافی، (۱۲)سیلابی کی کہانی، (۱۳)نیکی کی طاقت، (۱۴)میری ماں، (۱۵)وہ وقت، (۱۶)روزے کی خوشبو۔

محترم مزمل صدیقی سادہ اور دلکش اندازِ تحریر رکھتے ہیں۔ یہ صلاحیت ذاتِ باری تعالیٰ نے خاص طور پر انہیں عطا کی ہے۔ عام واقعات کو سادہ الفاظ سے کہانی کا روپ دے کر اس میں ایک اصلاحی سبق رکھنے کا فن خوب جانتے ہیں۔

قلم کے ذریعے مٹی کا قرض ادا کرنا وطن سے محبت کا واضح ثبوت ہے۔ کہانی کار اپنے تمام تر جذبات و احساسات کا اظہار کہانی کے اندر ہی کرتا ہے اور اگر وہ کہانیاں بچوں کی اصلاح کے لیے لکھی ہوں تو اس کا ثانی کوئی نہیں۔ جب یہ خبر مجھے ملی کہ میقات اوّل کے طالب علم نے بچوں کی کہانیوں پر مشتمل ایک کتاب لکھی تو سوچا کہ یہ بھی عام سی کہانیاں ہوں گی، لیکن جب ان کی تصنیف میرے زیرِ مطالعہ آئی تو مجھ پہ عیاں ہوا عام کہانیوں اور مزمل صدیقی کی اصلاحی کہانیوں میں بہت فرق ہے۔ دل میں تجسّس پیدا ہوا کہ کیوں نہ اس پوری کتاب کو پڑھا جائے تو تجسّس کی کیفیت میں پوری کتاب ایک دن میں ہی پڑھ ڈالی۔

مزمل صدیقی کی کہانیوں میں اللہ تعالیٰ سے محبت، وطن سے محبت، نیک اعمال کی طاقت، اساتذہ کا احترام جیسے اعلیٰ اصلاحی اسباق موجود ہیں۔ ان کی کہانیاں پڑھ کر اُن کی شخصیت کی بے چینی ہر قاری پر عیاں ہوتی چلی جاتی ہے اور قاری تجسّس میں ورق پلٹتا چلا جاتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں اخلاقی تعمیر و تربیت کا سبق واضح طور پر موجود ہے۔ ان کی کہانیوں میں وطن سے محبت کا جذبہ اور مٹی کا قرض ادا کرنے کا جوش اور ولولہ واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اگر قاری توجہ سے کہانی میں مقصد کو سمجھنے کی کوشش کرے تو وہ اپنے اوپر کہانی کی کیفیات محسوس کر سکتا ہے اور ایک سچے تخلیق کار کی کامیابی وہی ہوتی ہے جو اسے پڑھنے والے کو کچھ سوچنے پر آمادہ کرے۔ کہانی ''آؤ دیا جلائیں'' سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''پیارے بچو! آپ بھی عاطف کی طرح بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ ایک دیا جلتا ہے تو اس سے کئی دیئے جل اُٹھتے ہیں۔ آپ بھی اگر ''تبدیلی مہم گروپ''۔۔۔ کی شاخ اپنے سکول اور محلے میں کھولنا چاہیں تو ضرور کھولیں اور ہاں ایسے کاموں میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔''

ایک اور کہانی ''گھر پیارا گھر'' میں خوشحال زندگی گزارنے اور احساسِ کمتری سے بچنے کا

واضح درس موجود ہے۔ایک اور اقتباس دیکھیے :

''بیٹا! دوسروں کے پکے اور اچھے گھر دیکھ کر ہمیں اپنا ٹوٹا پھوٹا، خستہ حال گھر برا نہیں لگنا چاہیے۔ بڑے گھر کو دیکھ کر اپنے چھوٹے گھر سے نفرت نہیں کرنی چاہیے۔ گھر، گھر ہوتا ہے۔۔۔چھوٹا ہو یا بڑا۔''

میری دعا ہے کہ محمد مزمل صدیقی کو اللہ پاک زندگی کے ہر مقصد میں کامیاب کرے۔ اللہ زورِ قلم اور زیادہ کرے۔(آمین)

قلم قرطاس ادبی مجلس کے تحت خصوصی لیکچر کا اہتمام

قلم قرطاس ادبی مجلس شعبۂ اُردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد کے تحت (۷/اکتوبر ۲۰۱۵ء) کو ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا۔ تقریب میں نظامت کے فرائض حافظ عامر شہزاد، تلاوت حافظ محمد نعیم اور نعت رسول مقبول ﷺ کی سعادت محمد بلال نے حاصل کی۔اس کے بعد مہمانِ اعزاز ڈاکٹر افضل حمید نے اپنا لیکچر بعنوان ''پاکستان میں اُردو نظم رجحانات و اسالیب'' دیا۔

آخر پر صدر شعبہ ڈاکٹر آصف اعوان صاحب نے مہمانِ اعزاز کا شکریہ ادا کیا اور ان کو اعزازی تحفے سے بھی نوازا اور صدر شعبہ جناب ڈاکٹر آصف اعوان نے اپنے خطاب میں قلم قرطاس ادبی مجلس کے منتظمین کی اس کاوش کو سراہا اور ایسے ادبی پروگرامات کو مزید بہتر اور موٴثر طریقے سے منعقد کرنے پر زور دیا۔اس موقع پر شعبۂ اُردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد کے اساتذہ اور طلباء کی کثیر تعداد بھی موجود تھی۔

ڈاکٹر طارق ہاشمی

غزل

لبِ خموش مرا ، بات سے زیادہ ہے
ترا فراق ملاقات سے زیادہ ہے

بس اِک غبار سے بڑھ کر نہیں سیاحتِ خاک
مگر یہ سیرِ سماوات سے زیادہ ہے

یہ اِک شکست جو ہم کو ہوئی محبت میں
زمانے بھر کی فتوحات سے زیادہ ہے

بہت ہی غور سے سنتا ہوں دِل کی دھڑکن کو
یہ اِک صدا سبھی اصوات سے زیادہ ہے

اُمید بھی ترے آنے کی آج کم ہے ، ادھر
یہ دِل کا درد بھی کل رات سے زیادہ ہے

میں اُس سے عشق تو کر بیٹھا ہوں مگر طارق
یہ سلسلہ مری اوقات سے زیادہ ہے

ڈاکٹر اصغؔر علی بلوچ

غزل

خوابوں سے اَٹے رستے
طے ہم نے کیے رستے
ہم نے تیرے چلنے کو
ہاتھوں پہ دھرے رستے
بدلے نہ ہمی لوگو
ورنہ تھے نئے رستے
ہم ہی تھے ترِی منزل
ہم ہی تھے ترِے رستے
آجاؤ نا! رستے پر
کب سے ہیں کھڑے رستے
ٹھہرے تو سمے ٹھہرا
گزرے تو چلے رستے
وادی میں اُترتے ہیں
بل کھاتے ہوئے رستے
ہم دھول ہوئے ناحق
رَستے تو رہے رستے
پھر ہم کو بلاتے ہیں
ویران پڑے رستے
جنگل کے ہوئے باسی
جو بھول گئے رستے
چلنے کے نہیں اصغؔر
یہ روندے ہوئے رستے

ماجد مشتاق رائے

غزل

آنکھوں نے تیری یاد کی برکھا سنبھال کر
رکھا میرا خیال تو اپنا خیال کر

کیسے سمیٹ پاؤں گا ہمدردیوں کی بھیک
خود کو سنبھال پاؤں نہ ایسا سوال کر

ذکرِ فراق چھیڑ ذرا بے رُخی کے ساتھ
ہمدرد ہے تو یوں میرا جینا محال کر

یوں تو میرا نصیب تھے منظر بہار کے
اک شخص لے گیا میری آنکھیں نکال کر

جھوٹا رہا ہمیش ستاروں کا سلسلہ
تقدیر ماپتا ہوں میں سِکے اُچھال کر

سجیل قلزم

غزل

کیوے زلزلے ہیبت ڈھاتے ہیں، ہم لوگ خدا کو بھول گئے
پھر دیکھ قضا ڈر جاتے ہیں ، ہم لوگ خدا کو بھول گئے

جب رحمت باری جل تھل ہو اور من جنگل میں منگل ہو
یزداں سے پھر آنکھ چراتے ہیں ، ہم لوگ خدا کو بھول گئے

جب ٹھیس لگے پھر آنکھ بہے یہ درد روابط آن بنے
سب خود کو عبث بہلاتے ہیں ، ہم لوگ خدا کو بھول گئے

جو آنکھ سدا نمناک رہی اور ظلم کے پل بیباک رہی
وہی لوگ نجات کو پاتے ہیں ، ہم لوگ خدا کو بھول گئے

ہم جان سے پیارے کھو بیٹھے دامن اشکوں سے بھگو بیٹھے
اب دن میں خواب سجاتے ہیں ، ہم لوگ خدا کو بھول گئے

جو لوگ خدا کو بھول گئے وہ درد کا جھولا جھول گئے
قلزمؔ خود کو بہکاتے ہیں ، ہم لوگ خدا کو بھول گئے

اعجاز احمد

غزل

کسی تنکے کا سہارا نہیں ملنے والا
اب کے ڈوبے تو کنارا نہیں ملنے والا

اک سیاہ رات میں جی پاؤ تو بے شک آؤ
عشق میں چاند ستارا نہیں ملنے والا

شوق وہ سحر ہے جس شاہ گدا پر ہو جائے
عمر بھر اُس کا اُتارا نہیں ملنے والا

جا رہا ہے وہ مجھے جھوٹی تسلی دے کر
جانتا ہوں کہ دوبارہ نہیں ملنے والا

در بدر ٹھوکریں کھاتا ہوا مر جاؤں گا
تیرے بن مجھ کو سہارا نہیں ملنے والا

دل عجب آئنہ دیکھا ہے کہ جب دیکھو گے
پھر تمہیں عکس تمہارا نہیں ملنے والا

اس زمانے میں ہمیں ڈھونڈ نہ پاؤ گے کبھی
کوئی ہم سر بھی ہمارا نہیں ملنے والا